طلوعِ اسلام

اپریل ۱۹۵۰

اقبال نمبر

★★★

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتب: محمد یونس

قیمت فی پرچہ: آٹھ آنے (پاکستانی) — بارہ آنے (ہندوستانی)

بدل اشتراک: سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) — غیر ممالک کیلئے ۱۲ شلنگ

جلد ۳ — اپریل ۱۹۵۰ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

برہنہ شمشیریں (نظم)	۱
لمعات	۳-۶
یوم اقبال (نظم) (اسد ملتانی)	۷-۸
اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام (پرویز صاحب)	۹-۲۴
اقبال کے چند بنیادی تصورات (پروفیسر رازی صاحب)	۲۵-۳۸
اقبال کا ذہنی ارتقاء (ابوالظفر عبدالواحد صاحب)	۴۱-۶۳
یوم اقبال منانے والوں کیلئے	۶۴
مقام اقبال (سید عبدالواحد صاحب)	۶۵-۶۸
کشمیر۔ اقبال کی نظر میں	۶۹-۷۳
در منثور	۷۴-۸۰
علامہ اقبال کا ایک مکتوب علامہ اسلم جیراجپوری کے نام	۸۱-۸۴
عمرِ دراز باد	۸۵
اشتہارات	۳۹-۴۰، ۸۶-۸۸

برہنہ شمشیریں

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

خودی ہے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

قرآن آیا اور اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا جس میں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی۔ استبداد ملوکیت کی انسانیت کُش زنجیریں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں۔ افسونِ ہامانیت (برہمنیت، پیشوائیت، ملائیت اور خانقاہیت) کی مرگ آور زنجیریں جو زندگی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ اور مکائدِ قارونیت (سرمایہ پرستی) کی خون آشام زنجیریں جو شجرِ انسانیت کے پتے پتے سے نمِ حیات چوس لیتی ہیں۔ اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ دیا تاکہ انسانیت آزادی کی فضائے بسیط میں برگ و بار پیدا کرے کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتال تک پہنچ چکی ہوں اور اس کی شاخیں بامِ عرش کو چھو رہی ہوں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہا اس لئے کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ رہا۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہ دیا کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اطاعت و اتباع صرف ان قوانین کا رہ گیا جو انسانوں کو خدا کی طرف سے دیئے گئے اور چونکہ "خدا" عبارت ہے زندگی کی روحانی اساس سے، اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے مفہوم انسان کا اپنی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت ہوگیا۔ یہ قوانین ان غیر متبدل اصولوں پر مشتمل تھے جن کی روشنی میں انسانی زندگی اپنے منتہیٰ تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا ان قوانین کے بعد کسی اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح دین مکمل اور نبوت ختم ہوگئی۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کے بعد، انسانی معاشرہ کو اس کی ارتقائی منازل طے کرانے کا طریق یہ متعین کر دیا گیا کہ جس جماعت نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال لیا تھا، اسے اس ضابطۂ قوانین کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتی جائے اور ہر دور کا انسان، ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرتا ہوا، کاروانِ زندگی کو اس متوازن راستہ پر لے جائے جسے

صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا تھا۔

یہ قافلۂ رشد و سعادت ابھی تھوڑی دور جانے پایا تھا کہ ملوکیت کے رہزنوں نے اپنی کمین گاہوں سے سر نکالا اور اس قافلہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملوکیت بے ساز و یراق کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنی تائید میں پیشوائیت (Priesthood) اور غاصبانہ مفاد پرستی (Capitalism) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون، ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان غاصبانہ قوتوں کے راستے میں قرآن ہی سب سے بڑی روک تھی اس لئے انھیں اپنی کامیابی کیلئے اس سدِ راہ کو سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے کیا کچھ کیا گیا؟ تفصیل اس کی طویل ہے اور غور سے دیکھئے تو مسلمانوں کی ساری تاریخ گویا اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ غیر قرآنی تصوراتِ زندگی کے لئے ایک جامع اصطلاح "عجمی تصورات" ہے۔ ہماری تاریخ، تفصیل ہے اس کوشش مذموم و سعیٔ مشئوم کی کہ قرآن کی جگہ کس طرح 'عجمی تصورات' کو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی کر دیا جائے۔ یہ کوشش بڑی کامیاب رہی۔ ایسی کامیاب کہ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں پورے کا پورا قرآن یکسر عجمی تصورات سے بدل گیا۔ اور بایں انداز کہ یہ عجمی تصورات عینِ اسلام قرار پا گئے اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے قرآن لایا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کفر و بیدینی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور وہ اس سے اس طرح بھاگتا ہے کانھم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ۔

ہزار برس سے مسلمانوں پر یہی حالت چلی آ رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دوران میں اصلاحِ حال کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بہت سی سعید روحوں نے قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے اور اس کے دکھ کی دوا ڈھونڈنے میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا۔ لیکن یہ کوششیں علاماتِ مرض کے ازالہ سے آگے بڑھ کر علتِ مرض تک نہ پہنچ سکیں۔ اور مرورِ زمانہ سے مرض ایسا مزمن اور مریض ایسا سقیم و ناتواں ہوتا گیا کہ غیر تو غیر، خود اپنے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگ گئے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہی مایوسی تھی جو ایران میں باب اور بہاء اللہ کی شریعتِ جدیدہ اور پنجاب میں نبوتِ مرگ آفرینہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور جس نے تہذیبِ مغرب سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیتوں کو عام طور پر اپیل کیا۔ مذہب پرست طبقہ نے ان جدید نبوتوں کی تو مخالفت کی لیکن اسلام کے مستقبل سے مایوسی کا غیر شعوری اثر انھیں قومیت پرستی (Nationalism) کی آغوش میں لے گیا۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی وغیرہم اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

مسلمان، عالمگیر مایوسیوں کے اس خوفناک سیلاب میں بہا چلا جاتا تھا کہ مبدأ فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس، ہزار برس کے عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقام

تک جا پہنچی جہاں قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔ وہاں سے اس نے نورِ بصیرت حاصل کیا اور روشنی کی اس کرن نے مایوسی کی ظلمت انگیز طغیانیوں میں امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے تالب گور پہنچے ہوئے مسلمان کو پھر سے تھاما اور ایمان و ایقان کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ اس حقیقت کو اس کے سامنے واشگاف کیا کہ جس چیز کے مستقبل سے تجھے مایوسی ہو رہی ہے، وہ اسلام نہیں، عجم کے وہ تصورات ہیں جنہوں نے اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اسلام "قرآن کے اندر ہے اور قرآن اس خدا کا پیغام ابدی ہے جو ہمیشہ زندہ ہے اور جس پر موت تو ایک طرف، نیند اور اونگھ تک طاری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا قرآنی ممکنات سے مایوسی، زندگی کے حقائق سے چشم پوشی ہے۔ وہ تیس چالیس برس تک مسلسل و متواتر اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اس پیغام کے انداز مختلف تھے لیکن لَم ایک ہی تھی۔ اور وہ لَم یہ تھی کہ اس ہزار سالہ عجمی اثرات کو چھانٹ کر الگ کر دو اور قرآن کو اپنی نگاہ سے دیکھو۔ بات واضح ہو جائے گی۔ "قرآن کو اس طرح سمجھو گویا کہ یہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے"۔ اگر تم نے قرآن کو اس طرح سمجھ لیا تو یہ تمہارے شعور میں انقلاب پیدا کر دے گا اور انقلابِ شعور سے خارجی دنیا میں خود بخود انقلاب آ جائے گا۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبال یہ پیغام دے کر چلا گیا لیکن جو کچھ قرآن کے پیغامِ اولیں کے ساتھ ہوا تھا، وہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ قرآن زندگی کا پیغام تھا اس لئے اس نے بار بار اس کا اعلان ضروری سمجھا کہ یہ شاعری نہیں۔ شاعری ایک پیامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمانوں نے ان تمام تنبیہات کے باوجود قرآن سے ایسی شاعری کی کہ اسے چیستان بنا کے رکھ دیا۔ مذہب کو شاعری کی فضا خوب راس آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا بیج پھوٹتا ہی شاعری کی زمین سے ہے اور اس کی پرورش ہی شاعری کی فضا میں ہوتی ہے۔ دین کا مدار حقائق پر ہوتا ہے، مذہب کا انحصار الفاظ پر۔ دین زندگی کا ضابطہ دیتا ہے، مذہب چند موہوم تصورات پیش کرتا ہے۔ دین کے مسلمات کی پرکھ محسوس نتائج سے ہوتی ہے، مذہب ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ یہی کچھ شاعری کرتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، فنی قیود و شرائط کا شدت سے اہتمام اور ان سب کا نتیجہ کچھ وقت کی واہ واہ۔ اقبال نے قرآن کا پیغام دیا، اس لئے قرآن ہی کی اتباع میں وہ عمر بھر اعلان کرتا رہا کہ میرا پیغام شاعری نہیں، نہ شاعری اس کے شایانِ شان ہے۔ لیکن قوم ہے کہ اس کی ان تمام تنبیہات کے باوجود اسے شاعر بنانے پر مصر ہے۔ گانے والے اور گانے والیوں کی زبان پر کبھی داغ اور غالب کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کی جگہ اقبال کے شعروں نے لے لی ہے۔ قوالی کہ جس کے زور پر تصوف زندہ رہتا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ عقل و بصیرت کو ماؤف کر کے

انسان کے عملی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے۔ اقبال نے اسی لئے اسے افیون سے تعبیر کیا تھا۔ آج وہی قوالی اقبال کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ جو ملکت خود اقبال کے قرآنی تصور کا عطیہ ہے اس میں اگر کسی چیز سے بُعد اجنبیت بلکہ بغض وعناد ہے تو اقبال کے قرآنی پیغام سے۔ مذہب اور مفاد پرستی کا رشتہ پھر سے استوار ہو رہا ہے۔ زمینداریوں، جاگیرداریوں، کارخانہ داریوں، غرضیکہ انفرادی سرمایہ پرستی کی ہر لعنت کے جواز بلکہ وجوب کے لئے مذہب کی مقدس مسانید رشادت سے فتاوے صادر ہوتے ہیں۔ وطنیت کی لعنت ذاتوں، برادریوں اور خاندانوں سے آگے گزر کر صوبجاتی تفریق کی محکم گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔ قوتیں خدا کے قانون کے بجائے انسانوں کے ہاتھوں میں آ رہی ہیں کہیں آئین بن کر کہیں بے آئینی کی شکل میں۔

حالات ہر چند ناسازگار و ناموافق ہیں، لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قرآن جسے اقبال کا پیغام ہمارے سامنے دوبارہ لایا زندہ اور پائندہ ہے۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل صرف قرآن سے وابستہ ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں یہ حقیقت اقبال کی طرح ایمان بن کر سما گئی ہے ان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ بھی اقبال کی طرح اس پیغام کے عام کرنے میں اپنی پوری عمر بسر کر دیں۔ مردہ پرست قوم زندہ انسانوں کی باتوں کو نہیں سنا کرتی۔ وہ زندہ افراد کا گلا گھونٹ کر انھیں مار دیتی ہے اور پھر ان کی قبروں پر اپنی ہوس مردہ پرستی کی تسکین کے بڑے بڑے عظیم القدر مقبرے تعمیر کیا کرتی ہے۔ لیکن جس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود اقبال نے اپنے پیغام کے عام کرنے میں کبھی ہمت نہ ہاری۔ اسی طرح اس پیغام کی نشر و اشاعت میں ان لوگوں کو بھی عزم و ثبات سے کام لینا ہوگا۔ قرآن کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے، اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ سوال یہی ہے کہ یہ شرف کس قوم کے حصہ میں آتا ہے کہ وہ اس شمع ہدایت کے علمبردار بن کر انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو صحیح راستے پر لے چلے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

یومِ اقبال

یہ کھیل کیا ہے کہ اقبالؒ بن گیا اک بال
ہر ایک طفلِ دبستاں جسے رہا ہے اچھال

جہاد اُس کا تھا جس طرزِ شاعری کے خلاف
اسی سے گونج رہا ہے مشاعرے کا ہال

کہیں یہ رنگ کہ اس کا کلام با دف و چنگ
سُنا رہے ہیں گویّے، طوائفیں، قوّال

بس ایک مشغلہ دلچسپ مل گیا ہے، ہمیں
کہ اُس کا یوم مناتے ہیں دھوم سے ہر سال

غرض نہیں ہے کچھ اس سے کہ کیا کہا اُس نے
ہے صرف دادِ کلام اور اعترافِ کمال

ہے اس کے فکر پہ فخر اور اُس کے نطق پہ ناز
مگر قبول نہیں پھر بھی اُس کا استدلال

سُنائے نغمۂ دلکش تو شاعرِ اعظم
کرے جو ذکرِ خدا و نبیؐ تو کہنہ خیال

یہ کیا مذاق ہے اقبالؒ کے کلام کے ساتھ
خلافِ مقصدِ قرآں ہے اس کا استعمال

جو ہو مطابقِ خواہش تو حکمت و الہام
جو ہو خلافِ طبیعت تو شاعرانہ خیال

وہ جس کو فتنۂ مغرب قرار دیتا ہے
ہم آج اسی کو سمجھنے لگے دلیلِ کمال

ہے ذکرِ پردۂ نسواں پہ کیا عجیب جواب
سمجھ سکا نہ وہ بے چارہ یہ دقیق سوال

جو وہ حکومتِ حق کا پیام پہنچائے
تو ہم کہیں کہ ہے اس دور میں یہ امرِ محال

وہ جتنے درد سے دیتا ہے درسِ خودداری — ہم اور بنتے ہیں اہلِ فرنگ کے نقال
ہزار دیدہ وروں میں نظر نہیں آتی — نگاہِ بندۂ مومن کی ایک زندہ مثال
اک آدمی بھی ہے اقبال آشنا اس میں ؟ — بہت بجا ہی اقبال اکادمی کا خیال
کوئی یہ مجلسِ دستور ساز سے پوچھے — کہ سامنے کبھی آیا ہے اس کے یہ بھی سوال
وہ جس کے خواب کی تعبیر ہے یہ پاکستاں — نظامِ ملک کے بارے میں کیا تھا اُس کا خیال
کبھی خود اس کی تصانیف میں بھی ڈھونڈا ہے — کہ مل سکے کوئی تفصیل یا کوئی اجمال
کیا تھا اس نے کہیں ان میں رائے کا اظہار — کئے جو قائدِ اعظم کے نام خط ارسال
یہ خوب ہے کہ تصور تو اُس سے لیتے ہیں — مگر بناتے ہیں تصویر کے نئے خد و خال
یہ کس کو حق ہے کہ موجد سے چھین کر ایجاد — کسی جدید نمونے پہ لے اُسی کو ڈھال
خیال جس نے دیا اس کی بات بھی نہ سنیں — نہیں ہے کیا یہ اک احساں فراموشی کی مثال
ہوئی ہے قوم کو آخر یہ کس طرح جرأت — کہ اُس فقیر کی سب حسرتیں کرے پامال

اسد جو یوم ہے اقبال کا تو حق یہ ہے
کہ آج قوم کرے اپنے جرم کا اقبال

اسد ملتانی

اقبال کا پیغام۔ نوجوانانِ ملت کے نام

(پرویز)

بہت عرصہ کی بات ہے۔ میں کسی کام کے لئے عجلت میں تھا اس لئے بازار میں تیزی سے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے میرا کھوا چھل گیا۔ میں فوراً رکا اور اُس مردِ بزرگ سے معذرت چاہی۔ اس نے شفقت اور طنز کے ملے جلے لہجہ میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر کا تقاضا ہے۔ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آدمی تو ایک طرف، دیواروں تک کو مونڈھے مار کر چلا کرتے تھے۔" اس واقعہ کو ایک عمر گذر گئی لیکن اس پیرِ دانا کی بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جوانی کے زمانہ میں چونکہ فطرت کو قوائے جسمانیہ کی نشوونما مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ خون میں بجلیاں بھر کر رکھ دیتی ہے۔ جس سے نوجوان چلتا نہیں، دوڑتا ہے۔ اٹھتا نہیں، پھاندتا ہے۔ بیٹھتا بھی ہے تو کبھی نچلا نہیں رہتا۔ حرکت ـــ پیہم حرکت ـــ مسلسل حرکت ـــ یہ ہے جوانی کی نشانی۔ عمر کے ایک درجہ تک یہ سلسلۂ نشوونما بدستور جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترقی رک جاتی ہے لیکن اس کا ماحصل علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے۔ پھر انحطاط کا زمانہ آجاتا ہے جو جوانی کی گردن فرازی کو کبھی جھکوا دیتا ہے اور انسان ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق (بڑھاپے میں انسان کی حالت منکوس و منکوب ہو جاتی ہے) کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے۔

یہ تبدل و تحول، انسانی جسم تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر بھی ہوتا ہے۔ جوانی میں جس طرح اس کا جسم، ساکت نہیں رہ سکتا اسی طرح اس کے خیالات بھی جامد نہیں رہتے۔ ان میں بھی ہر آن ایک تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ "نچلے نہیں بیٹھتے"۔ کبھی یہ سکیم سوچتے ہیں۔ کبھی اس پروگرام کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ ہونا چاہیئے، وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ خیالات کیا، کوندے کی لپک اور شعلے کی جھپٹ ہوتی ہے۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ جس نوجوان کو دیکھو یہی کیفیت کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب رخے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بسیرم از قرارے

ان خیالات کی یہی برق رفتاری اور شعلہ بائی ان میں تحیر انگیز انقلابات کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے

صحیح کام لیا جائے تو قوم کی اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتی بلکہ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر انھیں سرکش و بیباک چھوڑ دیا جائے تو ان کا ماحصل ایک بگولہ کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ جوش و حرکت میں رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک نیا آسمان پیدا کر دے گا اور جب آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے تو زمین پر اپنا نقشِ قدم تک نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بعد یہی نوجوان جو ابھی ابھی ایک شعلہ جوالہ تھا، انحطاطِ عمر کے زمانہ میں، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے کہ جس میں نہ حرارت ہوتی ہے نہ حرکت۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے اس کا دم گھٹتا ہے۔ انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی ہے۔ بے بسی کی قناعت اس کے نزدیک "شرافت کی زندگی" اور بیکسی کا سکون اس کے خیال میں بزرگی کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جمود و سکوت کی قبرستانی زندگی پر قانع ہی نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حرکت و جنبش اس کے نزدیک بچپن کی خام کاریاں اور تیز خرامی و سبک سیری اس کے خیال میں جوانی کی تلون انگاریاں بن جاتی ہیں۔ پھر چونکہ عقلِ حیلہ جو انسان کو جھوٹے فریب سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے وہ اس سکوت و جمود کی زندگی کو سنجیدگی اور ثقاہت کے بزرگانہ پیرہن میں پیش کر کے اس کی عدم حرکت کو تقدس کا جامہ پہنا دیتی ہے اور اس کے خیالات کے خود و جمود کو تجربہ کی پختگی اور فکر کی تکمیل قرار دے کر اُسے "قطب" بنا دیتی ہے کہ ساری دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے لیکن یہ اپنے مقام سے نہ ٹلے۔ فکر و نظر کا یہی تعطل جب مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو انسان اسے اسلاف پرستی اور تقلیدِ آبا کا مقدس نقاب اڑھا کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح بعض آدمیوں کے قوائے جسمانی اخیر عمر تک صحیح و سالم رہتے ہیں اسی طرح ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جہاں انحطاطِ عمر کی برودت، انسانی خیالات کی حرارتِ انقلاب کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ صورتیں شاذ و نادر یعنی مستثنیات میں سے ہیں۔ کلیہ یہی ہے کہ من نعمرہ ننکسہ فی الخلق۔ عمر کی زیادتی سے حالت منکوس ہو جاتی ہے)۔ یہی وہ بڑے بوڑھے تھے جو صاحبِ ضربِ کلیم، جنابِ موسیٰ جیسے کوہ تمثال و فرعون شکن داعیٔ انقلاب کی دعوتِ جہاد کے اولین مخاطب تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انھیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ۔ لیکن ان پر عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریقِ مخالف کا خوف انھیں اس طرح چھلاوا بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ

"نہ صاحب! جب تک اس سرزمین میں بسنے والے وہاں موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں رکھیں گے، تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان سے لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" (۵/۲۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ اس قانونِ مشیت نے جس میں کسی کے لئے رعایت نہیں ہوتی، فیصلہ کر دیا کہ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ

سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْاَرْضِ (۵/۲۶) یعنی جب ان کی یہ حالت ہے تو یہی سرزمین جو ان کے لئے مقدر کردی گئی تھی ان پر چالیس برس تک حرام کردی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ، اس بیابان میں سرگرداں پھرتے رہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ، ان چلتی پھرتی لاشوں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے، تا آنکہ اس قوم کے بڑے بوڑھے ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور وہ نوجوان جن کی تربیت شہروں کی غلام ساز فضا سے دور، کوہ و بیابان کی آزاد ہواؤں میں ہوئی تھی، نئے دماغ، نئی زندگی، نئی آرزوں کو اپنے دلوں میں لئے حضرت موسیٰؑ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ (فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳)) یہی وہ آہن گداز نوجوان تھے جو انقلابی تصورات کو دماغوں میں لئے، بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت ذلیل و حقیر شمار کی جاتی تھی، قوم غالب کے خزائن و دفائن اور تخت و تاج کی وارث بن گئی۔

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹئے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آپہنچئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجر ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے مقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی، بساطِ بے نظام اور ہر فرد کا رواں، ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ، فکر سے عاری۔ دل، سوز سے خالی۔ نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور۔ قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑا اڑائے پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبدءِ فیض کی کرم گستری نے اقبالؒ جیسا مردِ خود آگاہ و خدا مست اس قوم کو عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق بساماں تھا، کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، فطرتِ انسانی کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق و معارف نے یہ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خونِ گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کفِ بدہاں سیلاب

کی طرح اٹھتا ہے اور ہر مزاحمت کرنے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیق نو ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ

جواں مردے کہ خود را فاش بیند ‏ ‏ ‏ جہانِ کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش ‏ ‏ ‏ کہ او با خویشتن خلوت گزیند

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے انہوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے ‏ ‏ ‏ پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ‏ ‏ ‏ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ بے تابی سے بحضورِ رب العزت ملتجی ہوتے ہیں کہ

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ‏ ‏ ‏ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ‏ ‏ ‏ مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ‏ ‏ ‏ مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری ‏ ‏ ‏ امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر ‏ ‏ ‏ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے۔ ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو یہی تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر ابلے اور خیابانِ ملت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے۔ اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن ‏ ‏ ‏ دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا ‏ ‏ ‏ بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

تاریخی آثار و شواہد جوان کے نورِ بصیرت سے [illegible] ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم — کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا — انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگہ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جذام میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں ہیں۔ جوانی کے پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے تنومند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں ہیں اس لئے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

ترے سوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

یہی کج کلاہانِ ملت، قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تخلیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔ دیکھئے کہ وہ کس حسرت سے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ — شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر زخود، مومن بغیر — خشت بنہ از خاکِ شاں معمارِ دیر

ان کی زندگی بے مقصد، ان کے افکار پریشاں، نہ کوئی متعین نصب العین نہ منتہائے نگاہ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مصافِ حیات سے گریز پائی۔

ایں مسلماں سادہ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام، ابنِ غلام، ابنِ غلام — حریت اندیشۂ او را حرام
ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ — نانِ جَو می خواہد از دستِ فرنگ

لیکن ان کی یہ تادیب، ایک طبیبِ مشفق کی تشخیص تھی. فیصلۂ عدالت کی تہدید نہیں تھی۔ ان کا ناوکِ تنقید، ایک جراحِ غم خوار کی نوکِ نشتر تھی، فریقِ متخاصم کی سنانِ زہر آلود نہ تھی۔ ان کی تنبیہ مُلّا کی نفرت انگیز لاحول نہ تھی، مادرِ مہربان کی سہیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجے پر پڑے۔ یہ قہر آلود نگاہیں غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدتِ غم سے آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔ وہ انھیں دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتے تھے اور سسکیاں لے لے کر کہتے تھے کہ

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی ۔۔۔ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انھوں نے اس لُٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ لُٹی کیسے! جب تک یہ نہ بتا دیا جاتا اس کے تحفظ و بقار کا انتظام کیسے کیا جا سکتا تھا؟

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے گی۔ ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے، کمزور انسانوں کو اپنی ہوسِ کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعمال کے اسباب و ذرائع بدلتے رہے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کارفرما رہی ہے۔ عہدِ جاہلیت میں چونکہ انسان کی عقلِ حیلہ جو نے ابھی ایسی پُرکاری نہیں سیکھی تھی، اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح، محکوموں کو پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھردرے اور کُند ہوتے تھے، جنھیں ہر آنکھ مشہود اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انسانی عقل مکر و حیل کی وضع و ساخت میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب کی طرح، مغلوب قوموں کو ضعیفی و زیردستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب و ذرائع بھی لطیف و غیر محسوس ہوتے چلے گئے۔ ان تمام ذرائع میں، تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں، ان کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ بلا مزید سعی و کاوش، وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی۔ اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہو جائے گی کہ اس قوم کو پتہ تک بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے۔ جب ہندوستان میں انگریز آیا ہے تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس کے تغلب و استبداد کے راستہ میں روڑا بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کیلئے وہی غیر محسوس لیکن تیر بہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری کی پوری قوم بدل گئی۔

یہ تھی وہ قوم غالب کی سحر آفرینی جو قوم مسلم کی تبدیلیٔ احوال (بلکہ تبدیلیٔ فطرت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی

اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب میں وہ فرماتے ہیں۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم — تیرے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

نوعِ دیگر ہیں، جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

تعلیم بدل جانے سے قوموں کی ریل گاڑی کا کانٹا مڑ جاتا ہے۔ کانٹا مڑنے سے جب ریل گاڑی پٹڑی بدلتی ہے تو دونوں پٹڑیاں میں غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے لیکن اگر کانٹا غلط موڑ دیا گیا ہو تو اس کے بعد پہیے کا ہر چکر گاڑی کو اس کی منزلِ مقصود سے دور لئے جاتا ہے۔ گاڑی کی حرکت بھی وہی ہوتی ہے اور رفتار بھی وہی۔ لیکن جب آخر الامر دیکھا جائے تو گاڑی اور اس کی اصلی منزلِ مقصود میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہی وہ غلط تعلیم تھی جس نے اتنی سی مدتِ قلیل میں پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جانے اور پھر اپنا مقام پہچانے۔ انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اسی کا نام علمِ صحیح اور دینِ فطرت ہے۔ اگر یہ تعلق غلط خطوط پر متعین ہو جائے تو نظامِ انسانیت میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مغرب نے خدا، انسان اور کائنات کے اقنومِ ثلاثہ میں سے سب سے بڑا رکن (خدا) پہلے ہی الگ کر دیا۔ علمِ انسان کا منتہا تسخیرِ فطرت اور اس سے حاصل شدہ قوتوں کا اپنے تغلب و تسلط کے لئے استعمال قرار پایا۔ جب اسی تعلیم کو وہ محکوم قوموں تک لائے تو تسخیرِ فطرت کے رموز و اسرار بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مغرب کے تفوق و برتری کو ذہنوں پر مسلط کر دیا جائے اور اس جذبۂ مرعوبیت کے ماتحت ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اپنی ہر قدر سے نفرت ہوتی جائے اور حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت جھلکتی نظر آئے چنانچہ رفتہ رفتہ قوم کی یہ حالت ہو گئی کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے اُن کی قوتِ سماعت سے ہیں۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے اُن کی بصارت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے اُن کی عقل کی روشنی سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹) انسان نہیں،

انسان نما حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ نتیجہ یہ کہ ذہنوں میں افکار مستعار، دلوں کے مقاصد دوسروں کے پیدا کردہ، نگاہوں کے زاویئے اوروں کے متعین کردہ۔ زبان اِن کی ہے بات اُن کی۔ چراغ اِن کا ہے رات اُن کی۔ یہ تھی وہ تعلیم جس کے نتائج سے مردِ حق آگاہ کے کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی اور وہ اِس آتشِ خاموش سے جھک کر جس نے اس کے مغزِ استخوان تک کو جلا دیا تھا، بے اختیار کہتا تھا کہ

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود ۔ از وجودش ایں قدر دانم کہ بُود

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر ۔ از مقامِ اُو نداد اورا خبر

وہ نوجوانانِ ملت کی چلتی پھرتی لاشوں کو دیکھتا اور نم آلود آنکھوں سے کہتا کہ

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے ۔ مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وہ جب ان مدعیانِ علم و ہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی مینا کاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہ جو درحقیقت اس کا خندۂ زخم پنہاں ہوتا تھا، ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ نازو تفاخر کس لئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

ترا وجود سراپا تجلئ افرنگ ۔ کہ تو وہاں کی عمارت گری کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی کرخالی ہے ۔ فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

احساسِ خودی اور خود نگہی، یہی شرفِ انسانیت کی اساس و بنیاد ہے۔ اور اس تعلیم سے اسی کو فنا کیا جاتا ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقت شناس نگاہ اس زہرِ ہلاہل کو کس طرح تریاق سمجھ سکتی ہے؟ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ

بہ آں مومن خدا کارے ندارد ۔ کہ در تن جانِ بیدارے ندارد

ازاں از مکتبِ یاراں گریزم ۔ جوانے خود نگہدارے ندارد

باسلوبِ دگر۔

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا ۔ موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ۔ پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

وہ مکتب کے اس کارگہ شیشہ گراں کو بہ ہزار عبرت و تاسف دیکھتے اور جب انھیں نظر آتا کہ ان جوانانِ نیک طینت و پاک سیرت کو جن کے فولادی جوہروں کو شمشیرِ بے نیام بننا تھا، کس طرح جاپانی کھلونے بنایا جا رہا ہے، تو وہ اک صدائے دردناک و الم انگیز سے کہتے کہ

شکایت ہے مجھے یارب، خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

پھر اتنا ہی نہیں کہ تعلیم کے اس نظام سے محکوم قوموں کے افراد کی خودی کو ہی فنا کیا جاتا ہے بلکہ قیامت بالائے قیامت کہ قوتِ حاکمہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں رکھ کر محکوم قوم کے صالح عنصر کو اس درجہ اپاہج اور مفلوج بنا دیتی ہے کہ وہ معاش تک کے لئے ان کی دستِ نگر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ جی میں آئے ان سے بآسانی کرا لیا جا سکتا ہے۔ یہ انسانی ذلت و پستی کی وہ انتہا ہے جس کا احساس ہر قلبِ حساس کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اسی انسانیت کش منظر کو دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور وہ درد و کرب کی انتہائی بے تابیوں کے ساتھ ایک آہ سرد بھر کر کہتے کہ

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے — نگاہ او چو شیراں بے پناہے

بہ مکتب علم میشی را بیاموخت — میسر نایدش برگِ گیاہے

کس قدر قیامت ہے کہ خودی جیسی متاع بے بہا کے بدلے ابن آدم کو روٹی کا ٹکڑا تک بھی میسر نہ ہو۔ اس کا سرمایۂ کونین چھین لیا جائے اور اس کے معاوضے میں اُسے دو کفِ جو تک نہ مل سکے۔

نوا از سینۂ مرغِ چمن بُرد — زخونِ لالہ آں سوزِ کہن بُرد

باین مکتب باین دانش چہ نازی — کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن بُرد

اسی لئے وہ اس نظامِ تعلیم و تربیت کو ملک الموت قرار دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں مدرسہ کے عنوان سے دیکھئے، کہتے ہیں:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہی اسرار ہیں فاش

اور اس کی ذمہ دار صرف وہی تعلیم نہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ وہ تہذیب ہے جو عصرِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے ساری دنیا کو یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

جواناں را بد آموز است ایں عصر — شبِ ابلیس را روز است ایں عصر

بدامانش مثالِ شعلہ پیچم — کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال تہذیبِ مغرب کے اس قدر مخالف کیوں تھے؟ کیا یہ مخالفت مُلّا کی وہ

قدامت پرستی تھی جس کی رو سے ہر نئی چیز دوزخ میں پھینک دینے کے قابل ہوتی ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک زندگی ایک جوئے رواں ہے جس کا کسی مقام پر بھی تھم جانا اس کی موت ہے۔ اس لئے جمود و تعطل ان کے نزدیک فطرت کے ضابطۂ قوانین میں جرم عظیم ہے جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ اس لئے وہ علمی عروج اور ذہنی ارتقاء کے کس طرح مخالف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا تہذیبِ مغرب سے ان کی مخالفت اور نفرت کی وجہ قدامت پرستانہ تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب باطل کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے ہر نگہ حق شناس اس میں فسادِ آدمیت کا جہنم مضمر دیکھے گی اور اس کی مخالفت کرے گی۔ تہذیبِ مغرب کیا ہے اور یہ کس طرح باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے؟ حق کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں پر کس قسم کا قصرِ تہذیب تعمیر ہو سکتا ہے؟ ان سوالات کا جواب تفصیل طلب ہے، اس لئے اس مقام پر اس سے بحث نہیں کی جا سکتی اس اجمال کی تفصیل میری کتاب معارف القرن کے صفحات پر پوری شرح و بسط سے پھیلی ہوئی ہے جس کا مطالعہ علوم جدیدہ سے متاثر ذہنیتوں کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کسی قوم کی تہذیب درحقیقت اس کے فلسفۂ زندگی اور تصورِ حیات کی محسوس مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے جب ہم کسی قوم کی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تو دراصل یہ بحث اس قوم کے فلسفۂ حیات سے متعلق ہوتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کی بنیاد زندگی کے میکانکی تصور (Mechanistic Conception of Life) پر ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی مادہ کے طبیعی ارتقاء (Physical Evolation) سے کسی نہ کسی طرح ظہور میں آگئی ہے اور جسم انسان ایک مشین کی حرکت سے اسے قائم رکھ رہا ہے۔ مرورِ زمانہ سے جب یہ حرکت بند ہو جائے گی تو زندگی ختم اور انسان نیا منیا ہو جائیگا۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴) (اور یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ ہم اب زندہ ہیں، عناصر کا شیرازہ بگڑ جانے سے مر جائیں گے اور اس طرح مرورِ زمانہ ہمیں ختم کر دیگا) لہٰذا نہ انسانی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفرِ حیات کا کوئی منتہیٰ۔

در نگاہش آدمی آب و گل است کاروانِ زندگی بے منزل است

اس تصورِ زندگی کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عزائم و اعمال کا معیار انفرادی اغراض یا زیادہ سے زیادہ افراد کے مجموعہ، یعنی قوم کے مفاد کا حصول قرار پا گیا۔ مستحسن اعمال وہ جن سے افراد کو دولت و حشمت اور اقوام کو غلبہ و تسلط حاصل ہو جائے خواہ اس کے لئے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ جائز و ناجائز کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے لئے کسی اقتدارِ اعلیٰ (Higher Authority) کے سامنے جوابدہ ہو۔ یہاں افراد زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک جائز وہ جو قومی مفاد کا تحفظ کرے۔ قوم اپنے سے اوپر کسی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوتی اسلئے

وہاں جائز و ناجائز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نظام تمدن و معاشرت کا فطری نتیجہ جنگل کا قانون ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس نظام نے دنیا کو کیا دیا؟ اس کے لئے اب کسی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں اور تو اور خود اس تہذیب و تمدن کے علمبردار اس کے ہاتھوں اس قدر تنگ آچکے ہیں کہ وہ اس جہنم سے نکلنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں، لیکن انہیں نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔ مشہور مفکر پروفیسر میسن (Mason) اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتدا سائنس کی کارگیری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں، زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل کچھ ایسے سہل نہیں۔

اور مشہور فرانسیسی مفکر (Rene Guenon) لکھتا ہے۔

> عہد حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رک گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے ...... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں ...... مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے۔ وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوع انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔[1]

(The Civilisation of the Modern World)

غور کیجئے کہ اس تہذیب نو کے علمبردار خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالاں ہیں۔ اور پھر سوچئے کہ جس دانائے راز کی فراست ایمانی اور بصیرت قرآنی نے اس کے سامنے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا اس نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ

بیا کہ ساز فرنگ از نوا بر افتاد است　　درونِ پردۂ اُو نغمہ نیست فریاد است

یہ نتائج جن کو دیکھ کر یورپ کے مفکر اور ارباب سیاست و تمدن یوں چیخ اٹھے ہیں، کوئی ہنگامی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ فطری نتیجہ ہیں اس تہذیب کا جس کی بنیادیں باطل پر استوار ہیں۔ چنانچہ تاریخ تہذیب کا مشہور عالم (Briffault) اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی قانون جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی مرمت

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد دوم۔

کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

اس نہجِ زندگی اور آئینِ حیات نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ پر کیا اثر کیا؟ اس کے متعلق کسی مشرق کے دقیانوسی فرسودہ خیال کی زبان سے نہیں بلکہ مغرب کے روشن دماغ مفکر ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ میں سنئیے۔ وہ لکھتا ہے :۔

> ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلا تعین مقصد چلا جا رہا ہے۔ انھیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے، نہ آئینِ حیات، نہ اقدارِ ہیں نہ معیار۔

اس بلا مقصد و معیارِ زندگی کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق مشہور فلسفی پیسکال (Pascal) نے لکھا ہے کہ

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب اسے ایمان اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو برے راستے اُسے خوش آتے ہیں۔

جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بدتر ہمارے نوجوان طبقہ پر گذری۔ یہ تھا وہ جہنم جس سے بچانے کے لئے حضرت علامہ نے نونہالانِ ملت کو پکارا اور اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر پکارا۔ کہ وہ غمگسارِ ملت خوب جانتا تھا کہ ان کی تباہی سے قوم تباہ ہو جائے گی اور ان کے سنبھلنے سے ملت کا مستقبل سنبھل جائیگا۔ اس لئے اس نے نہایت محبت اور شفقت سے انھیں اپنے قریب بلایا اور کہا کہ

چون چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما	اے جوانانِ عجم، جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام	تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم، نگاہم برتر از پروین گذشت	ریختم طرحِ حرم، در کافرستانِ شما
حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل	آتشے در سینہ دارم از نیاکانِ شما

انھوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی تہی مائگی سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس نہ سازو یراق ہے نہ ذرائع و اسباب۔ لیکن یاد رکھو، قوم کی حالت، نگاہ کی تبدیلی سے بدلا کرتی ہے۔ خارجی انقلاب ہمیشہ دل کے انقلاب کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اس لئے اسباب و ذرائع کی کمی اور متاع و منال کے فقدان سے مت گھبراؤ۔

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری	بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

بیٹے اپنی نگاہوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ دل میں قوتِ ایمان، نگاہوں میں نورِ بصیرت، بازوؤں میں جنبشِ کردار۔ سامنے

حق وصداقت پر مبنی نصب العین اور دماغ ہیں اس کے حصول کا ولولہ۔ اس سازوسامان کو لے کر نکلو اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (۳۴/۴۶) اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے [illegible] حالات وکوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصولِ مقصد کی ابتدا کر دو۔

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا | خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گل تازہ رسے ساختہ اند | پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا | صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز
تاکجا در تہِ بالِ دگراں می باشی | در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

اس نے ان کے سامنے آئینِ فطرت کا یہ عظیم الشان راز فاش کر کے رکھ دیا کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت (کیرکٹر) پر ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی | ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس لئے انہیں محکم یقین تھا کہ

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور | قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

وہ انہیں مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس لئے انہیں متنبہ کرتا تھا کہ

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں | جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری | اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

وہ انہیں برملا کہتا تھا کہ قوموں کی تقدیریں سہل انگاری اور عافیت کوشی سے نہیں بدل جایا کرتیں۔ سلطنتیں ریزولیوشنز پاس کرنے سے نہیں بلکہ ریزولیوشن (عزمِ راسخ) پیدا کرنے سے ملا کرتی ہیں۔ تاج و شکوہِ خسروی کے معاملے محفلِ چمن میں طے نہیں ہوا کرتے۔

تختِ جم و دارا سرِ راہے نفروشند | ایں کوہِ گراں است بکاہے نفروشند
با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

وہ جانتے تھے کہ غلط تعلیم و باطل تہذیب کے اثرات نے ان نوجوانوں کے جوہرِ مردانگی کو سلب، ان کے افکار کو آوارہ، ان کی نگاہوں کو پریشان اور ان کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ قوم کے اربابِ مسانید و نمادی اور صاحبانِ دعوت و ارشاد کی توجہ اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مبذول کراتے اور ان سے بار بار تاکید کرتے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ | مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس لئے کہ ان کی پریشاں نظری دور ہو جانے سے ان کے سامنے وہ درخشندہ نصب العین حیات بے نقاب ہو جائیگا جس کا حصول ملتِ اسلامیہ کا منتہیٰ اور تکمیلِ مشربِ انسانیت کی معراج ہے۔ نصب العین کی صداقت اور اس پر محکم یقین انسان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسلئے اس کے جگر میں خون، خون میں حرارت اور حرارت میں وہ شعلہ صفتی پیدا ہو جاتی ہے جو باطل کے ہر خس و خاشاک پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور اسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وہ "عقابی روح" ہے جس کی بیداری میں امتوں کی حیاتِ تازہ کا راز پوشیدہ ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

حضرت علامہ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں شاہیں کو مخاطب کیا ہے اس سے مقصود قوم کا جسور و غیور نوجوان ہی ہے۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ممکنات کی وسعتیں کس قدر حدود و قیود سے ناآشنا ہیں۔ دیکھئے یہ امیدوں کا شاہزادہ کس قدر شگفتہ و شاداب انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ نم کیا تھا؟ بس اسی میں اقبال کے پیغام کا سارا راز مضمر ہے۔ مغرب اپنے موجودہ نظامِ تمدن و معاشرت کے ہاتھوں جگر فگار ہے لیکن چونکہ اس کے سامنے حقائقِ ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں اس لئے اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غارت گرِ امن و عافیت اور رہزنِ متاعِ شرفِ انسانیت تہذیب کی تخریب کے بعد، نظامِ انسانیت کو کن جدید بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لیکن حضرتِ علامہ کے سامنے تو حقائقِ ابدی کا وہ ضابطۂ آئین و دستور کھلا رکھا تھا جس میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اسلئے انھیں امتوں کے مرضِ کہن کا علاج تجویز کرنے میں کچھ دقت نہ تھی۔ انھوں نے مریض کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور اپنے یقین کی پختگی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی علاج اس کا، وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ملت کی کشتِ ویراں کا نم، اسی آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہوتا تھا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے ملت کے نوجوانوں سے پوری قوت اور شدت سے کہا کہ یورپ آوارہ نظر اور پریشان نگاہ ہے اسلئے تمہیں اس کی تقلید سے کیا حاصل ہوگا۔ تمہارے صحنِ چمن میں تہذیب و تمدن کا وہ شجرِ طیب سایہ فگن ہے جس کی جڑیں حقائقِ ابدی کی گہرائیوں میں اور جس کی شاخیں کہکشاں گیر ہیں۔ شجرۃ طیبۃ

اصلہا ثابتۃ وفرعہا فی السماء۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء اور شرق و غرب کی ثغور سے بے نیاز ہے۔ لا شرقیۃ و لا غربیۃ۔ جس کے برگ و بار کی تازگی و شگفتگی پر ہزار جنتیں نچھاور اور لاکھوں بہاریں تصدق ہیں اور جسے دیکھ کر باغبانِ فطرت فرطِ مسرت سے والہانہ انداز میں جھوم اٹھتا ہے اور حاسدوں کے دل پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار (۴۸/۲۹) تم اس سدا بہار شجرِ مقدس کی شاخ سے گر پڑے ہو۔ تمہیں تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پھر سے اسی شاخ سے پیوست ہو جاؤ۔ زندگی کی تمام ترو تازگیاں تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی اور کامیابیوں کے پھول اور کامرانیوں کے خوشے اس کا ماحصل ہوں گے۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم برکش　　پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی

بس اس کیلئے کرنا یہ ہے کہ مغرب کی باطل افروز تہذیب اور انسانیت سوز نظریۂ زندگی کا جو رنگ تمہارے قلب و نظر کو آلودہ کر چکا ہے اسے الگ کر دو۔ یہ حصہ لا الٰہ ہے۔ اس کے بعد اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دیدو کہ قرآن تکمیلِ شرفِ انسانیت کیلئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ حصہ الا اللہ ہے۔ لا اور الا کے اس مجموعے سے تمہاری داستانِ حیات نئے سرے سے مرتب ہو جائیگی۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو　　مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو

اس ایمان سے تمہاری نگاہ کا زاویہ بدل جائیگا اور جب نگاہ کا زاویہ بدل جائیگا تو ساری دنیا بدل جائیگی۔ یہ ہے اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام۔ وہ پیغام جسے انہوں نے پیامِ مشرق میں "پند باز با بچۂ خویش" کے استعارے میں ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ شاہیں اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہر اند　　دلِ شیر دارند و مشتِ پر اند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش　　جسور و غیور و کلاں گیر باش
میامیز با کبک و تورنگ و سار　　مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
شد آں باشہ نخچیر نخچیرِ خویش　　کہ گیرد ز صیدِ خود آئینِ خویش
نگہ دار خود را و خورسند زی　　دلیر و درشت و تنومند زی
چہ خوش گفت فرزندِ خود را عقاب　　کہ یک قطرۂ خوں بہتر از لعلِ ناب
ز دستِ کسے طعمۂ خود مگیر　　نکو باش و پندِ نکویاں پذیر

قوم کے جن نوجوانوں میں یہ سیرتِ فولاد پیدا ہو جائے وہی قوم کی امیدوں کا سہارا اور اس کے آسمانِ مستقبل کا درخشندہ ستارہ ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا　　شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر　　اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز — کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو — یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

لیکن اقبال نے یہ سب کچھ اس زمانہ میں کہا جب، قوم کو حصولِ مقصد کے لئے تیار کیا جانا مقصود تھا۔ یہ مقصد بھی وہی تھا جسے اسی مردِ مومن نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر، قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پاکستان کے درخشندہ و محبوب تصور کی صورت میں وجہِ شگفتگیِ قلب و نگاہ ہوا۔ اس وقت قوم کے نوجوانوں کے ذمہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین کو جو ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی، انگریز اور ہندو کے قبضہ سے نکال کر اپنے حیطۂ اقتدار میں لے آئیں۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن اب نوجوانانِ ملت کے سامنے اس سے بھی بلند و بالا اور اشد و اہم فریضہ آ گیا۔ اور وہ فریضہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ خدا کی جو زمین انھیں اس طرح حاصل ہو گئی ہے اس میں خدا کے اُس ابدی قانون کو رائج کریں جس کی اتباع میں شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ کام قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائیگا۔ وہ پیرانِ کہن جنھوں نے اپنی زندگیاں ایک خاص نہج و اسلوب پر بسر کی ہیں اور ان کی عادات و امیال انہی روشوں پر پختگی حاصل کر چکی ہیں، ان کیلئے مشکل ہی نہیں (بعض اوقات) ناممکن ہوتا ہے کہ وہ ان قالبوں کو توڑ سکیں جن میں ان کے پیکر ڈھل چکے ہیں۔ دنیا کے نظامِ کہن کی جگہ جہانِ نو کی تعمیر قوم کے نوجوانوں کی قوتِ بازو ہی سے ممکن ہے اس لئے اقبال کی روح، آج پاکستان کے ہر نوجوان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور جو سعادت مند اس کی اس دعوتِ حیات بخش پر لبیک کہے، اس کے لئے پیغام یہ ہے کہ

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اقبال کے چند بنیادی تصورات

(پروفیسر فیروز الدین صاحب ساآزی سرگودھا)

قانونِ عروج وزوال قوموں کا عروج وزوال قانونِ قدرت کے تحت رونما ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا زوال وانحطاط بھی نتیجہ ہے اسی قانونِ قدرت سے انحراف کا۔ کلام اللہ میں بڑے سادہ اور بلیغ الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نے دینِ فطرت (خدا کے قانون) سے روگردانی کی تو تمہاری جگہ وہ دوسری قوم کھڑی کر دے گا، پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

إِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ۔

تمہارا رب ظالم نہیں کہ بستیوں کو یونہی تباہ کر ڈالے، حالانکہ ان بستیوں کے باشندے نیک اور صالح لوگ ہوں۔

اسی اٹل قانون کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا:۔

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا۔

یہ بستیاں جن کے کھنڈر تم دیکھ رہے ہو، ان کو ہم نے اس وقت تباہ کیا جب انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں پر بھی ابتلا و آزمائش کے کئی دور آئے۔ وہ زوال کی پستیوں میں بارہا گرے اور گر گر کر پھر اٹھنے کی کوشش کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے ہندی مسلمانوں کے لئے انتہائی تنزل کا دور تھا۔ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اعتقاد و عمل کی تمام گمراہیاں افراد پر مسلط تھیں۔ ملت کے سامنے کوئی مقصد یا نصب العین نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے وہ تمام امراض و رذائل جڑ پکڑ چکے تھے جو عموماً مرنے والی قوم کے نشانات سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا حالی نے اس مرنے والی قوم کا مرثیہ لکھا اور جمود کو توڑنے کے لئے قومی تاریخ کے کارنامے گنائے، سابقہ عظمت کی یاد دلائی، تنزل اور پستی کا احساس دلایا۔ یہ تشخیص تو صحیح تھی لیکن علاج اور مداوا کے بغیر۔

جب اقبال نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ (۱) ہندی مسلمانوں کے علاوہ باقی اسلامی دنیا کی حالت بھی یاس انگیز ہے۔ (۲) مغربی تہذیب و تمدن کا زہر مشرقی مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے۔ (۳) جمود، بے حسی اور بے عملی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ (۴) مذہبی عبادات و رسوم بے روح ہو کے رہ گئی ہیں۔ (۵) وطنیت، اشتراکیت، مادیت اور دہریت کے طوفان مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ (۶) اقتصادی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمان انتہائی پستیوں میں گر چکا ہے۔ چنانچہ اقبال مسلمانوں کے تمام ملی اور روحانی امراض کی نہ صرف ماہیت ہی دریافت کرتے ہیں بلکہ علاج کا نسخہ بھی تجویز فرماتے ہیں۔ ان کا پیغام اور تحریک از سرتا پا قرآن پر مبنی ہے اور ان کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہی ہے۔ یہ کہنا کہ علامہ کے افکار کی اساس نطشے، فشٹے، برگسان، ہیگل، کانٹ، ڈیکارٹ، الگزنڈر، میکٹگرٹ، یا دوسرے مغربی مفکرین و حکما کے فلسفہ پر ہے غلط ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ علامہ نے مشرقی و مغربی علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور دیگر مفکرین کے افکار و تصورات سے بقدرِ ضرورت استفادہ بھی کیا، وہ ہرچند حکیمانِ فرنگ کے درس سے فیضیاب ہوئے، ان کے قلب کا نور اصحابِ نظر کی صحبت کا مرہونِ منت ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں:۔

دانش افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

اقبال اور قرآن علامہ مرحوم کے کلام میں بیشتر اصلاحات، تلمیحات، شخصیات اور مقامات، اسلامی تاریخ صوفیائے کرام کی تصانیف اور قرآن و احادیث سے ماخوذ ہیں، فرماتے ہیں:۔

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ　　در شراب من سرورِ لا الٰہ

فکرِ اقبال کی تعمیر میں قرآن و حدیث کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، عارف سنائیؒ، فرید الدین عطارؒ اور مولانا رومؒ کے افکار اور فلسفہ و حکمت کا بھی حصہ ہے۔

رومی اور اقبال اقبال سب سے زیادہ مولانا رومی سے متاثر ہیں، وہی ان کے روحانی استاد ہیں۔ چنانچہ رومی سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

باز برخوانم ز فیضِ پیرِ روم　　دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم
جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار　　من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحر او منزل کنم — تا دُرِ تابندۂ حاصل کنم
من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم — زندگانی از نفس ہائش کنم
نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم — خویش را در حرف او واسوختم

دونوں کا منتہا و مقصود ایک ہے، دونوں کے افکار و تصورات میں مماثلت پائی جاتی ہے چنانچہ اقبال کو سمجھنے کیلئے رومی کے افکار سے استفادہ بھی ضروری ہے۔ رومی و اقبال میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس کی تشریح و توضیح کے لئے ذیل میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مقالہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

عارف رومی اور علامہ اقبال میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں، دونوں اسلامی شاعر ہیں، دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے۔ دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مرجح سمجھتے ہیں، دونوں خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بے خودی میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ ہے۔ دونوں کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسئلہ تخیل سے الگ ہے، دونوں کا خیال ہے کہ جزئی طور پر اعمالِ افراد پہلے ہی سے خدا کی طرف سے معین اور مقرر نہیں۔ بلکہ تقدیر آئینِ حیات کا نام ہے۔ دونوں ارتقائی مفکر ہیں، نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ منازل کی طرف عروج کر رہے ہیں۔ انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں۔ قوت، آرزو اور جہد صالح سے کئی نئی کائناتیں انسان پر نہ صرف منکشف ہو سکتی ہیں بلکہ خلق ہو سکتی ہیں۔ دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوعِ انسان کی معراج کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں۔ دونوں جد و جہد کو زندگی اور خستگی کو موت سمجھتے ہیں، دونوں کے ہاں بقا مشروط ہے سعی بقا سے۔ دونوں اپنے سے پیشتر کے افکار سے کما حقہ واقف ہیں اور متضاد عناصر کو ایک بلند تر وحدتِ فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ اس طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف رومی کا مرید سمجھتا ہے، یہ مرید معمولی تقلیدی مرید نہیں، کمال عقیدت کے ساتھ پیر کے رنگ میں رنگا ہوا مرید ہے لیکن آزاد! حقیقت یہ ہے کہ عارف رومی کا صحیح خلیفہ چھ سو برس کے بعد پیدا ہوا۔ جب تک دنیا میں مثنوی معنوی پڑھنے والے اور اس سے روحوں میں سوز و گداز پیدا کرنے والے باقی رہیں گے تب تک اقبال کا کلام بھی اس کے ساتھ پڑھا جائے گا، اور روحانی لذت اور زندگی پیدا کرتا رہے گا۔

مختصر یہ کہ اقبال نے مسلمانوں کے سامنے قرآن کے اسرار و رموز پیش کئے، ان کے روحانی امراض کا مداوا اسی سے ڈھونڈا۔ رمزِ لا الٰہ سے آگاہ کیا، وراثتِ ارض کے اصول بتائے، نیابتِ الٰہی کا مفہوم سمجھایا، حیات و مرگ کی حقیقت کو آشکارا کیا، اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی تفسیر پیش کی۔ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں اپنے خیالات کی اصل و بنیاد ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

مغرب اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔

اقبال نے اپنا پیغام شعر و نغمہ کے ذریعہ پہنچایا، یہ طریق یقیناً مؤثر اور دل کش ہے، اقبال کا منتہا و مقصود مریض قوم اور انسانیت کی اصلاح ہے۔ یہ سازِ سخن تو محض بہانہ تھا۔

نغمہ کجا و من کجا ، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ، ناقۂ بے زمام را

اب میں اقبال کے اُن چند بنیادی تصورات کا ذکر کروں گا جن کی اساس صرف قرآن حکیم پر ہے۔

عقیدۂ توحید اسلام میں سب سے بڑا بنیادی عقیدہ خدا پر ایمان لانا ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے فلاح و نجات کا یہ ایک اہم پیغام تھا جسے قرآن نے لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ میں دیا۔ لا کا سلبی پہلو یہ ہے کہ خود ساختہ معبودوں، آقاؤں، حکمرانوں اور مالکوں کو قبلۂ حاجات نہ سمجھا جائے۔ اور ایجابی پہلو یہ ہے کہ صرف معبودِ حقیقی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ آج کل کے اکثر مسلمان بھی کلمۂ توحید تصدیقِ قلب کے بغیر ہی پڑھتے ہیں اور دل کو صنم خانہ بنا رکھا ہے۔ مختلف معبودوں کے علاوہ اولاد، زر، زمین اور زن بھی مختلف بت ہیں جن کی پرستش میں ہم شب و روز مشغول ہیں۔

خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں ، خوفِ آلامِ زمین و آسماں!
حُبِ مال و دولت و حُبِ وطن ، حبِ خویش و اقربا و حبِ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست ، ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے وجود کی اس مختصر مملکت پر لا الٰہ الا اللہ کا صحیح معنوں میں غلبہ ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا ہر قول، فعل اور عمل اللہ کے لئے نہ ہو۔ جو شخص محض زبانی ہمارے سامنے خدا کے وجود سے انکار کر دے ہم اس پر پل پڑتے ہیں۔ اس کو

کشتنی، سوختنی اور گردن زدنی قرار دیتے ہیں، خواہ علاوہ وہ ہم سے بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے اعمال کا یہ حال ہے کہ ہر لمحہ خفیہ یا علانیہ مختلف گناہوں کے مرتکب ہو کر عملی طور پر خدا کے وجود سے انکار کرتے رہتے ہیں اور زبان سے کلمۂ توحید کا اعادہ۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید ہم کو کئی ایک بے حیائیوں سے بچاتا ہے۔ عزتِ نفس اور خودداری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو اسی رمز لا الٰہ سے آگاہ کیا ہے کیونکہ ان کے مختلف امراض میں سے ایک مہلک مرض یہی تھا جس نے مسلمانوں کو پست ہمت کر کے صراطِ مستقیم سے بھٹکایا۔

نہاد زندگی میں ابتدا لا انتہا الّا! — پیامِ موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

عقیدۂ توحید کا اثر انسانی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

فلسفۂ خودی علامہ اقبال کے بنیادی تصورات میں خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہ لفظ انہوں نے غرور، نخوت، تکبر یا سرکشی کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ یہ اصطلاح شعورِ ذات، خود اعتمادی، احساسِ انفرادیت، معرفتِ نفس، خود شناسی یا استحکامِ ذات کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔

فلسفۂ خودی کو سمجھنے سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ علامہ اقبال افراد و اقوام میں ایک انسانی سیرت کی تجدید و تولید چاہتے ہیں۔ اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ پسندیدہ کے ذریعے انسان کو بقائے دوام کا تاج پہنانا چاہتے ہیں۔ جمود، بے عملی، بے حسی، ذہنی تعطل اور دماغی تعیش کا استیصال چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی انسان کا کوئی مادی پہلو نہیں، بلکہ یہ ایک روحانی یا نفسانی چیز ہے۔ کشمکشِ حیات اور تنازع للبقا میں یہی روحانی خودی معیارِ زندگی ہے جو ہر ذی حیات میں موجود ہے۔ یہی بقائے اصلح کا ایک ذریعہ ہے۔ افراد کی طرح یہ خودی اقوام میں بھی پائی جاتی ہے۔ قومی خودی کے آگے انسانیت میں بھی ایک خودی ہوتی ہے اور پھر کائنات کی بھی ایک خودی ہے اور یہی کائنات کی اصل بنیاد ہے۔ مذہب کی اصطلاح میں اس کا نام خدا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسی لئے کہا ہے،

گر محبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

یعنی تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر پہلے خودی کی تلاش کر لے، خدا مل جائے گا۔ اس کے بغیر خدا کا ملنا دشوار ہے۔ کائنات کی

ہر ایک چیز خودی ہی کے زور سے قائم ہے۔ خودی نہ ہو تو یہ عالم درہم برہم ہو جائے۔ قطرہ کو دیکھئے خودی کے زور سے گوہر بن جاتا ہے۔ پہاڑ خودی کو چھوڑ دے تو صحرا یا دشت بن جائے، موج جب تک خودی کے زور سے سمندر کے پہلو میں موج بن کر رہے گی وہ سمندر کے کاندھے پر سوار ہوتی رہے گی۔ سبزہ زورِ خودی سے سینۂ گلشن چیر کر نکل آتا ہے۔ شمع کی تعمیر چند ذرات سے ہوتی ہے، جن کو خودی نے جکڑ رکھا ہے۔ لیکن جب اس نے خود گدازی اپنا پیشہ بنا لیا تو اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھی، آنسوؤں کی مانند اپنی ہی آنکھ سے ٹپک کر رہ گئی۔

خودی یا انانیت اپنا الگ ایک وجود رکھتی ہے۔ یہ وجود عمل سے پائیدار اور لازوال بنایا جا سکتا ہے۔ یہی انا فطرتِ انسانی کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد خودی مکان و زمان کی حدود و قیود سے بھی گذر جاتی ہے۔ خودی کی تکمیل و تربیت اور استحکام سے انسانیت انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے، پھر عالمِ انسانیت میں مردِ کامل یا فوق البشر کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی اقبال کا مقصود و مدعا ہے:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

خودی کے بغیر تمام عبادت بے معنی ہے۔ ذکر، نیم شبی، مراقبہ اور عبادت اگر خودی کو نہ بچا سکیں تو بیکار ہیں۔

یہ ذکر، نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا — وہی ہے مالکِ صبح و شام سے آگاہ
وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم — وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

حیاتِ خودی مقاصد کی تخلیق سے برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی تابندگی کا دارومدار شعاعِ آرزو پر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

زندگی کے بقا اور قیام کے لئے جستجو اور تلاش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے زندگی کی بنیاد ہی آرزو پر رکھی گئی ہے۔ کسی کسی آرزو کو دل میں برقرار رکھا جائے ورنہ یہ جسم مزار بن کر رہ جائے گا۔ آرزوؤں ہی کے ذریعہ تمام مقاصد کو شکار کیا جا سکتا ہے اور انہیں سے ہمارے تمام اعمال اور افعال کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ دل میں نئے نئے مقاصد پیدا ہوتے ہیں تو ہماری زندگی برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی آب و تاب کا انحصار شعاعِ آرزو پر ہے۔ بے مقصد و آرزو زندگی موت کے مترادف ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا استحکام چھ چیزوں سے ہو سکتا ہے (۱) محبت (۲) فقر (۳) شجاعت و ہمت (۴) تحمل (۵) کسبِ حلال (۶) قوتِ تخلیق۔

جس طرح کسی جاندار کو بقائے وجود کے لئے ہر قسم کے جراثیم یا مہلک امراض سے بچنا ضروری ہے اسی طرح حیاتِ خودی کو

بھی بعض مضر چیزوں سے محفوظ رکھنا ضروری ہے، مثلاً خوف (۲) سوال (۳) غلامی (۴) نسب پرستی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے خودی کمزور ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ارتقائی سلسلہ میں خودی کو تین حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے (۱) اطاعت (قانونِ حیات کی پابندی) اور ضبطِ نفس (نفسانی خواہشات وجذبات پر غالب آنا) (۳) نیابتِ الٰہی (انسانیت کا درجِ کمال)

افراد سے جماعتیں اور اقوام بنتی ہیں۔ اس لئے جب تک افراد کے اندر یہ خوبیاں پیدا نہ ہوں اقوام کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی اعلیٰ جماعت یا قوم کے لئے علامہ اقبال نے آٹھ خصائص کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ اول توحید پرستی، دوم نبوت و رسالت پر ایمان۔ سوم کتاب وسنت کی رہنمائی۔ چہارم مرکزیت۔ پنجم نصب العین ملی۔ ششم غلبہ واستیلا یا قوتِ تسخیر۔ ہفتم اجتماعی خودی۔ ہشتم حفظ واحترام امومت

اقبال کا تیسرا بنیادی تصور اتحادِ عالمِ اسلام ہے اور پھر اس کے ذریعہ اتحادِ انسانیت۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قومیت ووطنیت کی سخت مخالفت کی ہے۔

نیشنلزم کی مختصر تاریخ

بنی نوع انسان کی ابتدائی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ باہمی آویزشوں، خانہ جنگیوں اور خونریزیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ صدیوں تک انسان خاندان، نسب، نسل، قبیلہ اور مقام وطن کے جنون میں مبتلا رہا۔ ان مختلف تنگ دائروں کے اندر بھی قتل وغارت کا بازار گرم کرتا رہا۔ عہدِ وسطیٰ میں فیوڈل سسٹم یعنی جاگیردارانہ نظام اور تمدن وتہذیب دست وگریباں ہوتے رہے۔ بالآخر اس نظام کی اندرونی خرابی، عوام کی بے اطمینانی اور بدحالی ہی اس کے کفن کا تار وپود بن گئیں اور فیوڈل سسٹم کی جگہ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں نیشنلزم نے لے لی۔ دنیا جب مختلف گروہوں اور حصوں میں بٹ گئی تو حبِ وطن کا جذبہ اس قدر بھوٹ پڑا کہ مختلف ممالک اپنے مفاد، اغراض اور تحفظ کی خاطر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ تحفظ کے جذبہ کی جگہ تعصب نے لے لی۔ فرانس اس نیشنلزم کی تحریک میں پیش پیش تھا۔ یورپ کے دوسرے ممالک بھی اس تحریک میں کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ فرانس کے نیشنلزم کا عروج جون آف آرک (۱۴۳۱ء-۱۴۱۲ء) کے ظہور کا زمانہ تھا۔ مختصر یہ کہ یہی جذبہ اس حد تک ابھرا کہ قومی عصبیت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تمام جنگیں اسی نیشنلزم کے نام پر لڑی گئیں اور کروڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ ۱۵۲۷ء میں اطالوی مصنف اور سیاست داں میکیاولی نے سیاست اور مذہب میں تفریق پیدا کی اور ریاست کے مفاد کو مذہب اور اخلاق پر فوقیت اور ترجیح دینے کا پرچار کیا۔ یہ شخص فلارنس کا رہنے والا تھا اور مدتوں حکومت کے مختلف عہدوں پر سرفراز رہا۔ "پرنس" اس کی مشہور تصنیف ہے۔ میکیاولی کی تعلیمات کو اس عہد کے خیالات وجذبات کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی تعلیم کا اثر سولہویں، سترہویں، اٹھارہویں بلکہ انیسویں صدی تک رہا۔

قومیت اور وطنیت کے نام پر لاکھوں انسانوں نے جانیں قربان کردیں۔ کروڑوں بے گناہ بندگانِ خدا کا خون بہایا گیا۔ ان تین چار صدیوں میں نیشنلزم کے علمبردار کبھی تو آلیور کرامویل جیسے مستبد حاکم اور کبھی پیٹر اعظم، فریڈرک اعظم اور نپولین جیسے حاکمِ مطلق رہے۔ کبھی یہی نیشنلزم آمریت اور جمہوریت کا لباس پہن کر نمودار ہوتا رہا۔

نیشنلزم کے نتائج تاریخ کا ایک جنبدی بھی اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ نیشنلزم نے بنی نوعِ انسان کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ ایک ملک نے دوسرے ملک کو ہڑپ کرنے کی کوشش کی۔ بڑی بڑی طاقتور حکومتوں نے چھوٹی چھوٹی کمزور سلطنتوں کو سمیٹ لینا چاہا۔ باہمی پیکار اور کشمکش کے دروازے کھل گئے۔ چھوٹی چھوٹی جنگوں کو چھوڑ کر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم اور ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ کے نتائج دیکھ لیجئے۔ مہذب انسان کی درندگی، وحشت اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ کروڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ بستیوں کی بستیاں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ لاکھوں گھر نذرِ آتش ہوئے۔ کروڑوں انسان خانماں برباد ہوئے۔ لاتعداد بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی زندگیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تلخ ہو کر گئیں۔ تجارت، پیداوار اور صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔ مہنگائی، غربت، افلاس، ناداری اور فلاکت ان سب پر مستزاد!

نیشنلزم کے نام پر اس ہلاکت اور بربادی کو دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے سیاست دان، مفکرین اور حکما چونک اٹھے۔ صلح و آشتی اور وحدتِ انسانی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اقبالؒ کا مسلک بھی وحدتِ انسانی ہے۔ وہ منتشر افراد و اقوام کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہے۔ انسانوں میں اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ پسندیدہ دیکھنے کا متمنی ہے اور پرچمِ توحید کے اثر سے ان بکھرے ہوئے انسانوں کو شیرازہ بندی کی دعوت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے اس درس کی بنیاد یکسر اسلامی تعلیمات پر ہے۔ اسلام کسی قومیت کا قائل نہیں۔ خود اسلامی قومیت ایک ایسا وسیع دائرہ ہے جس میں دنیا کے ہر گوشے کے مسلمان سما جاتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل سطور اقبالؒ کے انہی خیالات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

> **اقبال اور قومیت** جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے! تاریخِ ادیان اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، اور یونانیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ مقاصد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی اور پرائیویٹ، بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد با وجود

تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرتا ہے۔ ایسا دستورالعمل قوم اور نسل پر مبنی نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو جغرافیہ کے تحت لایا جا سکتا ہے بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی متباین زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کیلئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے: ہم دلی از ہم زبانی بہتر است۔

اقبال اور وطنیت

میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی میں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب ہو گئی۔ یہ کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں، قابل اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے چلے آئے ہیں۔ کیونکہ سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے، ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

مفکرین اور حکما کی رائیں

قومیت اور وطنیت کی آگ کے شعلوں کو اب ٹھنڈا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اس کی ہلاکت کو دیکھ کر دنیا امن اور سکون کی متلاشی ہے۔ ایسا نظام یقیناً زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے تمام بڑے بڑے مفکرین اقبالؒ کے ہمنوا ہیں۔ مسٹر جان ایس ہائیلینڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

> تہذیب و تمدن کی بقا کی خاطر نیشنلزم کا دبا دینا ازبس ضروری ہے۔ حُب الوطنی ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں عالمگیر اخوت اور عالمگیر قومیت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

نشنلزم کا نتیجہ ہمیشہ باہمی پیکار و مناقشت اور تباہی و بربادی ہوگا۔ انسان ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو بالآخر ساری دنیا اس نیشنلزم کے شعلوں کی لپیٹ میں آکر بھسم ہو جائے گی۔

مسٹر ایچ۔ جی۔ ویلز اپنی مشہور کتاب The new world order (دنیا کا نظام نو) میں رقمطراز ہیں:

زمان و مکان کی حدود و قیود نے انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جب تک یہ تنگ نگاہی اور باہمی منافع چھوڑے نہیں جاتے انسان کا ایک مرکز پر اکٹھے ہونا محال ہے۔ عالمگیر سوشلزم کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ مذہب، نسل، رنگ اور وطن کے امتیاز کے بغیر سب انسانوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون نے اتحادی اقوام کے نمائندوں سے کہا:

میں یقین رکھتا ہوں کہ اپنی زندگی میں دنیا بھر کو ایک ہی حکومت کے ماتحت دیکھ لوں گا۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے ملکی حد بندی فضول نظر آنے لگے گی۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم شاعروں اور پیغمبروں کے اس نظریہ پر عمل پیرا ہوں جسے انسانی جمہوریت اور اتحاد کیا جاتا ہے۔

اس قدر تلخ تجربوں کے بعد بھی اب انسان اگر قومیت اور وطنیت کے تنگ دائروں میں پھنسا رہے تو یہ محض اس کی جہالت ہوگی۔ اگلی ارتقائی منازل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا کسی طرح بھی بنی نوع انسان کے لئے سودمند نہیں ہو سکتا۔ قدرتی طور پر انسان جن کڑیوں سے گزر چکتا ہے ان سے اس کو محبت ضرور ہوتی ہے۔ قبیلہ یا خاندان سے لگاؤ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ماں یا باپ کی محبت میں کمی ہو گئی۔ اس طرح انسانیت کے دائرہ میں آنے کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وطن کی کشش اور محبت جاتی رہے۔ بقول اقبالؒ واقعی یہ ایک فطری جذبہ ہے مگر اس کی پرستش بھی تو جائز نہیں۔ اقبالؒ کو وطن سے محبت ضرور ہے مگر وہ وطنیت کے تعصب سے بیزار ہے۔ اس کی پرستش کو بت پرستی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک دین اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وطن کا تعصب اقبالؒ کے نزدیک ایک لعنت ہے جو اسلام سے متصادم ہوتا ہے کیونکہ اسلامی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید پر ہے نسب، خاندان، قبیلہ اور وطن محض حوالہ و تعارف کے لئے ہیں۔

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

موت وحیات

کوئی فرد ہو یا قوم جس کسی کو بھی موت کا ڈر لاحق رہے اُسے عزت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں بڑے بڑے کام ان لوگوں نے انجام دیئے جو موت سے نہ ڈرے۔ بزدل کے اعصاب پر موت ہر وقت مسلط رہتی ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ بزدل ہمیشہ پست ہمت اور ذلیل ہوا کرتے ہیں۔ یہی حال موت سے ڈرنے والی قوم کا ہے۔ اس خطرناک مرض میں مبتلا ہونے کے سبب وہ قوم حمیت وغیرت، وقار وہیبت اور آزادی واستقلال کو کھو دیتی اور ذلت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اقبالؒ کو اپنی بیمار قوم میں یہ مہلک مرض بھی نظر آیا۔ چنانچہ اس نے حیات وممات کا فلسفہ سمجھایا۔ اقبال کے نزدیک جس چیز کو موت سمجھا گیا وہ دراصل بلند تر مرتبہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ زندگی ایک مسلسل چیز ہے جسے موت کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی:

خوگرِ پرواز کو پرواز کا ڈر کچھ نہیں — موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات — عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں — ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

افراد میں جاں نثاری، سرفروشی اور قربانی کا جذبہ ہو تو وہ قوم جس کے یہ افراد ہوں موت کے ہاتھوں مٹ نہیں سکتی، بلکہ سربلند و سرفراز ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک ساری داستانِ حرم یہ ہے کہ ابتدا اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی سے ہوئی اور انتہا امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر۔ فرماتے ہیں:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

ملتِ اسلامیہ کے درخت کی آبیاری بہادروں، شہیدوں اور سرفروشوں کے خون سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے

اوراق الٹ کر دیکھئے کہ مسلمان کئی بار باطل سے ٹکرائے لیکن دبے نہیں، بلکہ ہر بار اُبھرے۔ اقبال اس حقیقت کا اظہار انتہائی فخر و ناز سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم — سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مولانا روم نے بھی فلسفۂ موت کو بڑے لطیف انداز میں سمجھایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے انسان جب تو عالمِ وجود میں آیا تو عناصر اربعہ میں سے کوئی چیز تھا یا ان سب کا مرکب۔ اگر تو اسی پہلی حالت پر ہی رہتا تو یہ ارتقائی منازل کیسے طے ہوتیں۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے پہلے وجود یعنی جمادات کی بجائے نباتات اور نباتات سے حیوانات کا وجود عطا ہوا۔ پھر حیوان سے انسان کے درجہ تک پہنچا۔ یہ بقا فنا ہی سے حاصل ہوئی۔ پھر فنا سے ڈرنے کا فائدہ؟ پہلی فنا کی حالتوں نے جوہرِ انسان کو کونسا ضرر پہنچایا جو موت سے ڈر کر جسمانی زندگی سے چمٹے رہیں۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک انسان نے لاکھوں حشر دیکھے، لیکن باوجود اس کے ترقی ہی کرتا چلا گیا تو پھر محض بقائے جسم کی خاطر یہ پریشانی اور خوف کیوں ہو؟ اب مرشد رومی کے چند اشعار سنئے:

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی — آتشے یا خاک یا بادے بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا — کے رسیدے مرترا ایں ارتقا
از تبدّل ہستیٔ اول مماند — ہستیٔ دیگر بجائے او نشاند
ایں بقاہا از فناہا یافتی! — از فنا پس رو چرا برتافتی؟
صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود — تاکنوں در لحظہ از بد رد جود
در فناہا ایں بقاہا دیدۂ — بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ

مختصر یہ کہ جس دن مسلمانوں نے موت کا ڈر دل و دماغ سے نکال دیا وہ عروج و کمال کی بلند ترین چوٹیوں تک پہنچ جائیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اقبال کے پیام کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

عقل و عشق کلامِ اقبال میں عقل و عشق کا تصور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عقل نام ہے مادی اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرنے والی قوت کا، مصلحت اندیشی اور احتیاط اس کے ضروری اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مکان و زمان کی قیود کی پابند ہے۔ اس کے پاس مظاہر کے علم یا خبر کے سوا اور کچھ نہیں۔ (علم یا خبر کا دارومدار حواس پر ہے) اس کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معرفت ہے، یہ اکثر اسباب و علل کے لامتناہی سلسلہ میں پھنس کے رہ جاتی ہے اور حقیقت کے عقدہ کو حل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ہمیں یہ درس دیتا ہے:

خرد زنجیری امروز و دوش است — پرستار بتانِ چشم و گوش است
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عشق نام ہے والہانہ جذبہ کا۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذب کلی ہے۔ عشق و محبت کا یہ جذبہ انسانی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس سے انسانی ذہن زمان و مکان کی قیود اور زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ عشق کا منشا پیہم آرزو ہے۔ دل کی دنیا اس سے آباد ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق بوالہوسی نہیں بلکہ زندگی کے لئے محرک عمل ہے۔ اس جذبہ سے تسخیر فطرت کا کام بھی لیا جا سکتا ہے! اس کے ذریعہ انسان کی نظر بلند ہو جاتی ہے۔ عشق ہی سے کائنات کی رونق ہے عشق نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو کے رہ جائے۔ عشق زندگی کی ایک تخلیقی قوت ہے!

اقبال عقل کا مخالف نہیں لیکن وہ محض عقل پر ہی تکیہ کرنا درست نہیں سمجھتا۔ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اس کے نزدیک عشق و عقل کے امتزاج سے انسانی اعمال کی رہنمائی کی جا سکتی ہے! عشق اور عقل دونوں منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، لیکن دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ عقل افتاں و خیزاں کسی حیلے سے منزل تک پہنچاتی ہے لیکن عشق منزلِ مقصود کی طرف تیز گامی سے لے جاتا ہے۔

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں
عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ راہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟ — چراغِ راہ گذر کو کیا خبر ہے!

مندرجہ ذیل نظم کے مطالعہ سے اقبال کے اس تصور کی وضاحت ہو جائے گی۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے، عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے امّ الکتاب

شہد کی مکھی

اس مختصر اور جامع کتاب میں بائبل اور قرآن حکیم کے علاوہ دیگر الہامی کتابوں کے بھی حوالوں سے شہد کی مکھی کے حالاتِ زندگی ایک نئے انداز میں دیئے گئے ہیں۔ چند ایک تصاویر جو کہ چھتہ۔ مکھیوں کے جھرمٹ۔ مکھی کے بچوں وغیرہ کی ہوں گی۔ ساتھ شامل کردی گئی ہیں۔

یہ کتاب ملک صاحب بی کیپر کی ایک نئی پیشکش ہے جس کے متعلق سندھ گورنمنٹ کے بی ایکسپرٹ (ماہر نحل پروری) کی یہ رائے ہے کہ

"اس کتاب میں مؤلف نے کچھ مذہبی رنگ بھر دیا ہے تاکہ لوگوں کو حقیقت اور اچھی طرح واضح ہوجائے۔ نصرت، ہجرت اور شہادت جو مذہب اسلام میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے اس کا عملی پہلو مشاہدہ کرنا ہو تو شہد کی مکھیوں کے چھتوں میں دیکھو۔ اخوت کا لازوال پہلو دیکھنا ہو تو ان ننھی ننھی مکھیوں کے چھتوں میں آپ کو نظر آئیگا۔ بہرکیف یہ کتاب سلیس اور آسان زبان اردو میں لکھی گئی ہے۔" (ایم اے عزیز غازی)

کتاب کے آخیر میں شہد کی مکھی پالنے والوں کیلئے ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ لاہور، لائلپور، اور ایبٹ آباد اور میرپور خاص کی درسگاہوں میں نحل پروری کی تربیت حاصل کرنیوالے حضرات کیلئے یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔ یہ کتاب اس وقت زیر طبع ہے۔ شائع ہوتے ہی سندھ گورنمنٹ اور پنجاب گورنمنٹ کی زراعتی درسگاہوں میں بھیج دیجائیگی۔ جو صاحبان اس نحل پروری کی گھریلو صنعت سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ چونکہ تجارت و منفعت پیش نظر نہیں، اسلئے مقررہ تعداد میں شائع ہوگی۔ قیمت فی نسخہ دو روپے علاوہ محصولڈاک ہوگی۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ۔ ۱۳ جودھپور بلڈنگ۔ مہاراشٹر روڈ۔ رام سوامی۔ کراچی

قائد اعظمؒ کے آنسو

اور

ادارہ "فیض الاسلام"

یہ شہادت نہیں امر واقعہ ہے کہ قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے جب قحط بنگال کے اجڑے ہوئے یتیموں کا حال دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے اپنی جیب خاص سے یتیم خانہ انجمن فیض الاسلام کو ۵۰۰ روپیہ نقد عطا فرما کر اس کی بنیاد مستحکم کی اور اپنے عملی نمونے سے مسلمانوں کو اس کی سرپرستی کی ترغیب دلائی۔ اس کے بعد یہ ادارہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا زیادہ سے زیادہ مفید و مبارک ثابت ہو رہا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اسے قوم کے اکابر کا بہترین اعتماد حاصل ہے۔ [illegible] کے زیر اہتمام یتیم خانہ کے علاوہ ایک دارالصنعت ایک سکول اور ماہنامہ "فیض الاسلام" کامیابی سے چل رہا ہے۔

"فیض الاسلام" کا حلقہ مطالعہ پاک و ہند کے علاوہ ایران، افریقہ، برما، لنکا، امریکہ اور یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔

"فیض الاسلام" بچوں، عورتوں اور عام مسلمانوں کیلئے دینی، اخلاقی، روحانی، علمی، ادبی اور ملی نعمتوں کا ایک دلچسپ اور نفع بخش دسترخوان ہے۔

"فیض الاسلام" ایک مستقل ادارے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے نہایت مستحکم حیثیت کا مالک ہے۔

آپ "فیض الاسلام" کی سرپرستی قبول فرما کر اپنی قوم کے یتیموں کی، اپنی قوم کی بلکہ خود اپنی امداد کریں گے۔

قیمت سالانہ پاکستان	پانچ روپے	قیمت سالانہ ہندوستان	چھ روپے آٹھ آنے
فی شمارہ	آٹھ آنہ	فی شمارہ	دس آنے

ممالک خارجہ سالانہ پندرہ شلنگ —— مشتہرین اور ایجنٹ صاحبان اپنے آرڈر بھجوا دیں

مینجر "فیض الاسلام" راولپنڈی

نیا ادب نئی زندگی کا ضامن ہوتا ہے

سوشلزم اور اسلام	۲/-
ذہن کی ڈائری	۲/۴
رنگ محل	۳/-
گرینہ	۴/۸
شمع	۶/-
شمیم	۶/۸
انور	۶/۸
دیوار	۳/-
[illegible]	۲/۸
ترنگے کی چھاؤں میں	۳/۸
نسیم	۳/۸
نسرین	۴/-
حاقتیں	۳/۸
مدوجزر	۲/۸
آگ اور خون (زیر طبع) عارف بٹالوی	۵/-

معراجِ انسانیت

قیمت بیس روپے

اسلامیات

معارف القرآن جلد اول	۱۰/-
، ، ، دوم	۱۰/-
، ، ، سوم	۱۵/-
، ، ، چہارم	۲۰/-
تاریخ اسلام	۱۰/-
فرعون و کلیم	۳/-
جہان نو	[illegible]
دو قرآن	۳/۸
مردِ مومن	۳/۴
تاریخ انقلابات عالم	۱۰/-
حقوق فرائض اسلام	۶/-
اسلام کا تمدنی سیاسی نظام	۵/-
اسلام کا نظریۂ جہاد	۲/-
سیرت اقبال	۶/۸
جہانِ اقبال	۴/۸
معارفِ اقبال	۳/-
ملفوظات اقبال	۴/-
آخری لمحات	۲/-

عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ کراچی

اقبال کا ذہنی ارتقاء

از ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔اے

آج اقبال کی شاعری اور ان کے کمال کے چاروں طرف گُن گائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے حوصلے کے مطابق ان کی شاعری اور شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے جیتے جی بھی لوگوں نے ان کے دلفریب اور جوش انگیز شعروں کو بہت کچھ سراہا اور جی کھول کر داد دی۔ مگر اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں، ان کی ہر اک ادا، ان کی دل میں وہ بھنے والی باتیں اور بھی یاد آتی ہیں۔ قدرِ نعمت بعدِ زوال!

یہ طرفداری نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اقبال جیسا شاعر اردو زبان نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال سے پہلے جتنے شاعر اردو زبان نے پیدا کئے ان میں کوئی خوبی نہ تھی۔ مثال کے طور پر انیس اور غالب کو لیجئے جو اقبال سے کچھ ہی پہلے کے شاعر ہیں۔ دونوں نے اردو کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔ یا اکبر اور حالی کو لیجئے جو عین اس زمانے کے شاعر ہیں جب اقبال نے پر تولنے شروع کئے تھے۔ اکبر کی شاعری کا شگفتہ رنگ اور ہنسی ہنسی میں دل میں نشتر چبھونا، یا حالی کا ملک اور قوم کا دکھڑا بیان کرنا، کون ہے جو نہیں جانتا؟ ان دونوں کے مقابلے میں داغ بھی تھے جو اتنے پائے کے شاعر نہ تھے۔ کہنے کو پرانی لکیر پر چلتے تھے مگر زبان ایسی بانکی پائی تھی کہ سنئے تو دل لوٹ پوٹ ہو جائے۔ پھر ذرا غور سے دیکھئے تو وہی رونا رونا یا خیال مگر بیان کرنے کا ڈھب ایسا کہ بے واہ واہ کہے بن نہ پڑے۔ یہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آدمی کو آپ پرانی وضع اور دقیانوسی خیال کا آدمی سمجھیں، لیکن جب وہ کچھ کہے تو آپ بے اختیار پھڑک اٹھیں، داغ شاعر تھا۔

میں نے یہ سب ذکر یوں ہی بے سبب نہیں کیا۔ ان تینوں چاروں شاعروں کا اثر شروع شروع میں اقبال پر پڑتا رہا۔ یہانتک کہ اپنی نوعمری اور تقلید کے دور سے گذر کر اقبال نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا اور ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کے باوجود بھی اقبال نے سدا اپنے پیشروؤں کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اوچھے ہیں وہ جو اپنے محسنوں کے احسان کو بھول جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ بڑا آدمی ناشکرا نہیں ہوتا۔ اقبال نے غالب، داغ، حالی اور فارسی زبان کے بڑے بڑے شعرا کی بڑائی کو مانا ہے اور عقیدت کے طور پر ان لوگوں پر نظمیں لکھی ہیں

جن سے اس کی نیک نیتی صاف جھلکتی ہے۔ خصوصاً غالب، داغ اور حالی پر جو نظمیں "بانگِ درا" میں ہیں، انہیں پڑھ کر اپنے طور پر اندازہ کر لیجئے کہ ایک بڑا آدمی اپنے بڑوں کی بڑائی ماننے سے کبھی نہیں جھینپتا۔ اور تو اور شیکسپیر پر بھی ایک پیاری نظم ہے، حالانکہ شیکسپیر ہماری زبان کا شاعر نہیں۔ اسی طرح بعض ہندو بزرگوں اور ہندو اوتاروں کی سیرتوں پر بڑی دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، رام چندر جی، لچھمن جی اور گرو نانک وغیرہ۔

بہرحال، اکبر اور حالی اور خاص طور پر داغ اور حالی کی شاعری کا ہندوستان کے چاروں طرف غلغلہ تھا جب کہ اقبال نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا احساس کیا اور چپکے چپکے شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کے تمام ہونہار شاعروں کی طرح پہلے پہل غزل گوئی ہی سے شاعری کی ابتدا کی۔ داغ کی شاعری اور زبان دانی کی چاروں طرف دھوم تھی، وہی عاشقانہ رنگ اختیار کیا۔ لوگ دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے مرعوب تھے۔ پنجاب اور سیالکوٹ کی زبان دانی تو خیر کسی شمار قطار میں نہ تھی، ہندوستان کے دوسرے علاقے جہاں اردو کا چرچا تھا، دہلی اور لکھنؤ سے سند لیتے تھے۔ ایسی صورت میں اقبال کسی اہلِ زبان کا دامن نہ تھامتے تو کیا کرتے۔ لامحالہ استاد داغ کا دامن تھاما اور ان سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں تک خط کتابت کے ذریعہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کو داغ نے سیر چشمی سے کام لے کر ہمت بندھائی اور لکھا کہ تمہیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں، تم جوہر قابل رکھتے ہو، اپنی طبیعت کے بہاؤ پر چلو، خود ہی اپنا راستہ نکال لوگے۔

اسی زمانے یا اس سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کیسے جوہر شناس تھے۔ سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس کر کے اقبال لاہور آئے تھے، بی۔ اے میں پڑھ رہے تھے، شعر گوئی کا سودا زوروں پر تھا، غزلیں کہتے تھے اور بعض اوقات خوب مضمون نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر سنئے، لاہور میں ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں اس زمانے کے خاص خاص شاعر جمع تھے۔ اقبال کے بعض بے تکلف دوست انہیں جبراً یہاں لے آئے اور غزل پڑھنے پر مجبور کیا۔ مرزا ارشد گورگانی میر مشاعرہ تھے۔ جب اقبال نے اپنی غزل کا ایک شعر پڑھا تو بے اختیار پھڑک اٹھے۔ شعر تھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی غزل کا مقطع بھی ہے جو ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہونے والا ایک بڑا شاعر کس قدر اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہے، حالانکہ بڑائی کی منزل ابھی دور ہے:

ہم کو تو لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہے غرض اقبال ہم اسیر ہیں زلفِ کمال کے

کتنے بیبرانہ الفاظ تھے جو ایک فیضانی کیفیت میں اقبال کی زبان سے نکلے۔ اس وقت کے سننے والوں نے اسے محض شاعرانہ تعلّی

اور تعلی سمجھا ہوگا، لیکن ہونے والے اقبال نے جس کی شہرت ہندوستان سے باہر دور دور پہنچنے والی تھی، بعد کو یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کا طلسم یوں توڑا جاتا ہے۔ خادم زبان اور ادیب ہونے کے لئے جوہر قابل کی ضرورت ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اُلانگنا ضروری نہیں۔

لیکن زبان کے الجھیڑوں سے آزاد ہونے سے پہلے اور بعد بھی اقبال ایک زمانے تک غالب کے زیر اثر رہے۔ گو کہنے کو انھیں داغ سے تلمذ تھا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاگرد تھے۔ اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔ اقبال غالب کے اتنے گرویدہ کیوں تھے؟ اس کے کئی ایک سبب ہیں۔ غالب کی طرح اقبال بھی جدت اور انوکھے پن کے حامی تھے۔ غالب ہی کی طرح فلسفیانہ طبیعت پائی تھی۔ فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعہ نے ان کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا کر دی تھی۔ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم کی واقفیت نے مختلف اسالیب پر عبور حاصل کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔ جرمن زبان کی واقفیت کے باعث جرمن ادب کے شاہکاروں پر براہِ راست انھیں عبور حاصل تھا۔ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے اور اس طرح سنسکرت لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فارسی کا پوچھنا کیا۔ "پیا در پدر گر ایں جا بود زبان دانی" کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن وہ کر دکھایا کہ ایک مغرور ایرانی بھی ان کا نام ادب سے لیتا ہے۔ غرض کہ اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے عالم بھی تھے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ شاعری ان کی کنیز بن کر رہی۔ یہ جامعیت اردو کے شعراء میں تو کیا، دنیا کے اور باکمالوں میں بھی کم ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ غالب کی شاعری میں جو کمی تھی، اقبال نے اس کو پورا کیا۔

بہرحال ایک زمانے تک اقبال غالب کے زیر اثر رہے اور تو مشقی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی جب کہ غالب کی عقیدتمندانہ تقلید چھوڑ کر انھوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا تھا، یہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے غالب کے دیئے سے دیا جلایا اور جس منزل پر غالب نے چند ناتمام نقوش چھوڑے تھے، اقبال نے وہاں سے ابتدا کی اور چند اضافوں کے ساتھ اسے بامِ تکمیل پر پہنچایا۔

انگریزی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "شاعر اپنے عہد کا بچہ ہوتا ہے"۔ عہدِ ماضی کا جو اثر اقبال پر ہوا، وہ تو ابھی میں بتا چکا، اس انگریزی مقولے کی روشنی میں اب یہ بتانا ہے کہ "اپنے عہد" کا اقبال پر کیا اثر ہوا۔ اس مضمون کا بقیہ حصہ اسی رخ کی تصویر ہے۔

جس زمانے میں پورے طور پر اقبال نے اپنی شعری استعداد کا احساس کیا، ہندوستان کی سیاسی فضا قومیت اور آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ تلک اور گوکھلے "ہوم رول" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ گاندھی جی اور برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا، پھر بھی خاصے جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ سیاسی پلیٹ فارم پر دھواں دھار تقریریں ہو

کانگرس نے بھی قومیت کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ سرسید کی پرخلوص کوششیں بارآور ہو چکی تھیں۔ حالی کی نوحہ خوانی کچھ رنگ لا رہی تھی۔ "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے" کی تان سے مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا احساس ہو چلا تھا۔ گو "قلب کو گرمانے" اور "روح کو تڑپانے" والی آواز ابھی فضا میں پیدا نہ ہوئی تھی اور دعاؤں نے "شکوہ" کا رنگ اختیار نہ کیا تھا، تاہم بھارت کا یہ تھکا ہارا قافلہ چونک رہا تھا۔ غرض کہ یہ کچھ معاشری اور سیاسی حالات تھے۔ یہ تذبذب اور انتشار کا زمانہ تھا جب کہ اقبال نے چند نظمیں مثلاً ہندی ترانہ، نیا شوالہ، ہمالہ، میرا وطن وہی ہے اور تصویر درد لکھیں اور تمام ہندوستان اس نئے شاعر کی والہانہ تانوں سے گونج اٹھا۔

ان نظموں کے علاوہ جو ملک کی سیاسی حالت کی ترجمانی کرتی ہیں، اس دور کی چند اور نظمیں بھی ہیں جو اقبال کی افتادِ طبیعت، ذہنی بے چینی، تجسس اور تلاش کا پتہ دیتی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ابھی اپنی زندگی کا مقصد پایا نہیں، خودی کا احساس ابھی تیز نہیں ہوا اور وہ اسرار اس پر منکشف نہیں ہوئے جن سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ حبِ وطن کے بہانے گیت گا کر دلوں کو گرمانا ضرور ہے لیکن خود اس کے دل میں تذبذب اور شکوک کا ایک طوفان برپا ہے۔ اس کا دل سراپا تجسس اور استفسار بنا ہوا ہے۔ وہ زندگی اور حقایقِ زندگی کی عقدہ کشائی کرنا چاہتا ہے۔ چاروں طرف اس کی نگاہیں پڑتی ہیں مگر کسی طرف سے اس کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کہیں گل کی رنگینی کو دیکھ کر وہ حسن کی کشش کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے، کہیں شمع و پروانہ کی دل سوز حکایت میں وہ حسن و عشق کی حقیقت پانے کی دھن میں رہتا ہے۔ کبھی فراز آسمان پر مہر و ماہ کی جانب اس کی نظریں دوڑتی ہیں، لیکن کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں پاتا۔ گو بظاہر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے دل کو سمجھانے کے حیلے بہانے تراش لیتا ہے۔ گل رنگین، شمع و پروانہ، بچہ اور شمع، آفتاب، ماہِ نو، جگنو، چاند، ستارے، کنارِ راوی، موجِ دریا۔ یہ تمام نظمیں غور سے پڑھئے۔ آپ کو اقبال کی اس تلاش اور بے چینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ سب جستجو محض اس لئے تھی کہ اقبال اپنے لئے ایک بڑا نصب العین اور مقصدِ حیات متعین کرنا چاہتے تھے۔ ایک نئے راستے کی لگن ان کے دل میں تھی۔ وہ مقصدِ حیات بننا اور زندگی اور موت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی انھیں اپنے پر کامل بھروسہ نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی پورے طور پر انھوں نے خود کو پہچانا ہے۔ ابھی ابھی جن نظموں کے عنوانوں کا حوالہ میں نے دیا ہے، ان کے کچھ اشعار سنئے آپ کو بہتر اندازہ ہوگا کہ میں کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

محفلِ قدرت ہے اک دامانِ ہے پایانِ حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

(بچہ اور شمع)

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو — اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں — زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

(گلِ رنگین)

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں — خبر نہیں مجھے، لیکن کھڑا ہوا ہوں میں
رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز — ہوا ہے موجوں سے ملاح جس کا گرمِ ستیز
جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی — ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا — نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(کنارِ راوی)

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی — اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا، عدم آباد، وطن ہے میرا — صبح کا دامنِ صد چاک، وطن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا — ساقیِ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی — اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

(ستارۂ صبح)

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا — وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا
نظارۂ شفق کی خوبی زوال پر تھی — چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی روشنی دی
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے — ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہے؟

(جگنو)

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں، تو اور ہے — درد جس پہلو میں اٹھتا ہے، وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

(چاند)

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں — وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(موجِ دریا)

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں — طفلکِ بیتاب پاہوں مکتبِ ہستی میں میں

(ماہِ نو)

یہ ناصبوری، یہ تڑپ، یہ ذوقِ آگہی، یہ نور کی طلب اور یہ وسعت کی خواہش، سب کیا ہے؟ وہی ایک اعلیٰ نصب العین کی تلاش جس کی صلاحیت شاعر خود میں نہیں پاتا۔ غرض کہ کچھ اس قسم کی کھٹک اور خلش دل میں لیکر اقبال یورپ کا عزم کرتے ہیں اور وطن کو خیرباد کہنے سے پہلے حضرت نظام الدینؒ محبوبِ الٰہی کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ وہاں پہنچکر یہ بندِ جذبات پھوٹ پڑتے ہیں، چنانچہ اپنی منظوم التجا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اس خیال سے یورپ جا رہے ہیں کہ شاید وہاں انھیں اپنے ذوقِ استفہام کا جواب اور دل کی اس بے تابی کی دوا ملے:۔

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیںؔ — کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

شکستہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

یہ طلب اور یہ ارادے لے کر ۱۹۰۵ء میں اقبال ہندوستان سے رخصت ہوئے اور ان تاثرات پر اس دور کی شاعری کی تان ٹوٹتی ہے۔ بعد میں اقبال کی شاعری نے جو پلٹا کھایا اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

البتہ ایک چیز خاص طور پر نظر کے سامنے رکھنی چاہیئے جو اس دور کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اور آنے والے دور کی شاعری میں اور بھی شدت کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر میں وہ ایک پیمبرانہ شان اختیار کر لیتی ہے۔ اس خاص چیز سے میری مراد اقبال کا گہرا مذہبی رنگ ہے۔ مذہب ان کی گھٹی میں تھا اور جس صوبے کی آب و گل سے اقبال کی سرشت کا ضمیر بنا تھا، مذہبی اعتبار سے پورا صوبہ اور علاقوں کے مقابلے میں شدت کے ساتھ مذہبی عصبیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ موجودہ

حالات میں اقبال کا لہجہ بہتوں کے لئے غلط فہمی کا باعث ہوا اور بعض قوم پرستوں نے یہ سمجھا کہ "اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا"۔ اصل حقیقت سچ پوچھئے تو یوں نہیں ہے، یہ ان کا نہیں بلکہ سمجھنے والوں کی سمجھ کا قصور ہے۔

اپنے تین سالہ قیام (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸) کے زمانے میں جب کہ اقبال یہ کچھ توقعات لے کر شراب علم کے حصول میں نگار خانۂ وطن سے یورپ کی سرزمین پر پہنچے اور وہاں کے حالات اور رنگ ڈھنگ کا غور سے مطالعہ کیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی قومیت جس کا پودا ہندوستان میں لگایا جا رہا تھا، یورپ میں خاصی بدنام اور خود غرضی کی مترادف ہو چکی تھی۔ جغرافی حدبندیوں نے نسل و رنگ کے امتیازات پیدا کرکے انسانوں کو تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا۔ مادیت اور مادہ پرستی نے انسان کو انسانی ہمدردی اور روحانی و اخلاقی مسائل سے بیزار اور بے بہرہ کر دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ جو کچھ ہو اور جو کچھ کیا جائے، سب اپنی ہی بھلائی اور ذاتی نفع کیلئے ہو۔ جمہوری نظام کی باگیں خطرناک قسم کے بنیوں اور خونخواروں کے ہاتھ آ گئی تھیں اور سرمایہ دار بڑی بے دردی کے ساتھ غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ اپنے حصولِ مقصد کے لئے قومیں قوموں کے خلاف، جماعتیں جماعتوں کے خلاف اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف آستینیں چڑھا کر موقع کا منتظر تھا۔ جنگ کے ڈراؤنے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ کشیدگی اور تصادم کیا رنگ لانے والے تھے؟

ان حالات میں اقبال نے دیکھا کہ یہ قومیت اور وطنیت کا بھوت، انسانوں کو درندوں سے بدتر بنا کر رہے گا۔ غرضکہ قومیت، مساوات اور تہذیب و شائستگی کے گیت گانے والی یہ قومیں ایک طرف تو انہوں ہی کے حلق پر خنجر چلانے پر تلی بیٹھی تھیں اور دوسری طرف یہ منصوبے ہو رہے تھے کہ جس طرح بن پڑے اپنے حصولِ مقصد کی خاطر مشرقی اقوام کو آہستہ آہستہ ہڑپ کر لیا جائے اور بسم اللہ ترکی اور ایران سے کی جائے۔ اسی مقصد کے مدنظر ترکی کے خلاف بلقان اور اٹلی کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں برطانوی سیاست کا بھی درپردہ ہاتھ تھا۔ "مریض یورپ" کا ادھر یہ حال تھا، اُدھر برطانیہ اور روس کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے ایران کی جان کے لالے پڑے تھے۔ ان واقعات اور احساسات کی تھوڑی سی جھلک آپ کو اقبال کی اُس نظم میں بھی دکھائی دے گی جس کا عنوان ہے "ہلالِ عید"۔ چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں:

قافلے دیکھ اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ — رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر — اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی، تو — اور جو بے آبرو تھے، اُن کی خودداری بھی دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن — اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

غرض کہ ان اسباب کی بنا پر اسلامی ممالک کی فلاح اور یک جہتی کی خاطر وہ تحریک شروع ہوئی جس کو ہم اسلامی تحریک یا "پان اسلامزم" کہتے ہیں۔ اپنے قیامِ یورپ کے زمانے میں اقبال اس تحریک کی حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے اور اپنی آنکھوں سے یورپ کی ہوس کاری اور بدنیتی کا منظر دیکھ کر انھوں نے "ہمہ اسلامیت" کو اپنی شاعرانہ سحر کاریوں کا موضوع بنانے کی دل میں ٹھان لی اور مشرقی اقوام کے سامنے قومیت اور عالمگیر برادری کا اعلیٰ تصور پیش کیا۔ پھر اپنی شاعری کے لئے وسیع تر میدان پیدا کرنے کی نیت سے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی رواداری، اسلام کا شاندار ماضی، اور اقوامِ عالم پر اس کے عظیم احسانات، یہ سب ایسی کھلی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اقبال نے اسلامی ممالک کو ان کے شاندار ماضی سے روشناس کرا کے، اگر ان کے سینوں میں عمل اور بیداری کی لہر دوڑا دی تو برا کیا کیا؟ پھر یہ کہ گو "لے" حجازی تھی مگر کاہل رگوں میں خونِ حرارت دوڑانے میں یہ نوا سب کے لئے برابر تھی۔ اس میں ہندی اور ترکی، عجمی اور تازی، یا ہندو اور مسلمان کی کچھ تخصیص نہ تھی۔ لیکن سینوں کے کھوٹ نے اس درد اور خلوص بھری آواز کے معنی ہی کچھ اور لئے اور جس طرح ایک غلط فہمی یہ پھیلی کہ اقبال اردو سے بیزار ہو گئے اسی طرح بعض حلقوں میں یہ بدظنی بھی عام تھی کہ اقبال قوم پرست سے مسلم پرست اور ہوتے ہوتے کٹر فرقہ پرست ہو گئے، حالانکہ اقبال کا پیام بیداری و عمل سب کے لئے ہے۔ جس طرح زبان (اردو سے فارسی) بدل گئی تھی مگر دل وہی تھا، اسی طرح قومیت کا ڈھانچہ بدل سا گیا تھا مگر روح وہی رہی تھی۔ بھلا جو شاعر قومیت اور رنگ، نسل اور ذات پات اور برتری اور کمتری کے جھگڑے مٹانے آیا تھا، کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست ہو؟ اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں بڑی غلط فہمی ہوئی اور کوئی اللہ کا بندہ بروقت ایسا نہ کھڑا ہوا کہ اس بدظنی اور غلط فہمی کو اقبال کے جیتے جی دور کرتا۔ اس چیز نے اقبال کی مقبولیت اور شہرت کو بڑا صدمہ پہنچایا اور وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

بہرحال یہ اسباب ہوئے کہ اقبال نے "قومیت" کو چھوڑ کر "ملیت" کا راگ گایا اور مغرب کی عقیدت مندی کو چھوڑ کر اس کے خلاف جہاد شروع کیا اور چن چن کر اس کے عیب گنوائے۔ چنانچہ قیامِ یورپ کی چند نظموں کو چھوڑ کر (جن میں شکوک تجسس اور تلاش کا رنگ گہرا ہو گیا ہے) بعد کے دور کا تمام کلام یورپ کے خلاف احتجاج اور قومیت اور جمہوریت سے بیزاری کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی ان کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع ہے۔

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں اور لٹریچر کو غور کی نظر سے دیکھا تھا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تہذیب کی ابتری اور تباہی کی ذمہ دار فارسی شاعری بھی تھی جس نے افلاطونی فلسفے کی موشگافیوں میں پھنس کر حیات کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ سکون اور بے عملی کو

مقصدِ حیات تصور کیا جانے لگا۔ افراد میں خودی اور خودداری کی بوند رہی اور ذلت و نکبت موجبِ فخر سمجھی جانے لگی۔ یہ روگ آہستہ آہستہ پوری قوم اور ملت کی رگ وپے میں سرایت کرتا گیا۔ اردو ادب کچھ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ ایک تو براہ راست فارسی شاعری کے اثر سے اور پھر (سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد) اس ملک کے عام اثرات کی وجہ سے جو صدیوں غلامی میں بسر کر چکا تھا اور انحطاط و تنزل جس کی رگوں میں بسا ہوا تھا۔ اس مجہولیت نے ہندوستان میں بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ اس مجہولیت کے خلاف جہاد کرنا اور ہندیوں کی رگوں میں خونِ حیات اور عمل کی برقی لہر دوڑانا، اقبال کے نزدیک انتہائی ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اپنا منظوم دستور العمل مرتب کیا جو اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے نام سے مشہور ہے۔ اسرار و رموز کا فلسفہ علاوہ اسلامی ممالک کے، ہندوستان کیلئے ایک خصوصی اپیل رکھتا تھا۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اوراق کی ترتیب سے پہلے اقبال نے کئی ایک پرجوش نظمیں لکھیں جن سے ان کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کا پتہ لگتا ہے۔ ان نظموں میں بعض اس زمانہ کی ہیں جبکہ جنگِ بلقان کے شعلوں کا دھواں ہندوستان تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ شکوہ، فاطمہ اور جوابِ شکوہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو مسلمانوں کے امنڈتے ہوئے جذبات اور اس ذہنی ہیجان کی ترجمانی کرتی ہیں جو ترکی کی بقا اور فنا کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ میں نام نہاد قومیت پر کچھ چوٹیں بھی ہیں اور اس کے برخلاف اس عالمگیر اخوت اور انسانی برادری کی طرف اشارے بھی ہیں جو نسل، رنگ اور دوسرے امتیازات سے پاک ہو۔

اسی زمانے (۱۹۱۲ء) میں شمع و شاعر لکھی گئی جو اس دور کی نظموں میں سب سے اچھی نظم ہے اور جس کو بانگِ درا   ل کہنا بجا ہے۔ اقبال کا سارا فلسفۂ خودی یہاں سمٹ کر دل بن گیا ہے۔ فلسفے اور شعر کا یہ خوش گوار امتزاج   یا تو یہاں ہے یا پھر بالِ جبریل کے ساقی نامے میں جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ان طویل نظموں کے علاوہ چند چھوٹی بڑی نظمیں اور بھی ہیں جن میں حیات اور فلسفۂ حیات کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ وہ مسائل جو پہلے اور دوسرے دور کی نظموں میں شاعر کی نگاہوں میں چیستان معلوم ہوتے تھے اور اس کی ذہنی بے چینی کا باعث بنے تھے، ان کا عقدہ اب کھلتا جا رہا ہے۔ فرازِ آسمان پر پہلے کی طرح اس کی نظریں پڑتی ہیں تو وہی چاند اور ستارے   جو اس کی حیرت اور پریشانیوں میں اضافہ کرتے تھے، اپنے سربستہ رازوں کو اب آہستہ آہستہ فاش کر رہے ہیں۔ قدرت کی ہر شے اسرار کے خزانے اگل رہی ہے۔ شاعر کے نالے آسمانوں کے اس پار پہنچ رہے ہیں اور خود شانِ کبریائی جب ازل و ابد کے بھید اس کے سامنے آئینہ کر رہی ہو تو بھلا ان چیزوں کی ہستی کیا ہے؟ بہرحال پہلے دور کی کم و بیش انہیں عنوان کی نظموں سے ان نظموں کا مقابلہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہی چاند ہے، وہی شمع، وہی پروانہ، وہی موجِ دریا، وہی کنارِ جو، لیکن جو چیزیں پہلے گم صم نظر آتی تھیں،

اب ایک مردِ خود آگاہ کے سامنے حقائق اور حقائقِ زندگی کے اسرار کُھل رہے ہیں۔ ان کو غور سے اپنے طور پر پڑھئے۔ طوالت کے خوف کی وجہ سے میں ان نظموں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔

غرض کہ ادھر یہ سب نظمیں تیزی کے ساتھ لکھی جا رہی تھیں جن میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحانات صاف جھلکتے ہیں اور اُدھر فارسی زبان میں اسرار و رموز کے تانے بانے بھی درست ہو رہے تھے۔ پہلی مثنوی جنگِ عظیم کے دھماکے کے ایک سال بعد (۱۹۱۵ء) اور دوسری اس دھماکے کے خاتمے سے ایک سال پہلے (۱۹۱۷ء) شائع ہوئی۔

دونوں مثنویوں کا خاکہ، مولانا رومؒ کی لازوال مثنوی پر تیار کیا گیا ہے، وہی زبان، وہی بحر، وہی اسلوب، حتیٰ کہ باریک مسائل اور حقائقِ مجردہ کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے حکایت اور "ایلیگوری" (تمثیل) میں بیان کرنے کا ڈھنگ بھی رومی ہی کا ہے۔ پہلی مثنوی کے تمہیدی حصے میں صاف طور پر اقبال نے پیر رومی سے اپنی بے اندازہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ چیز ہمیں اور زیادہ عجیب معلوم ہوتی ہے، خصوصاً جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بعض چوٹی کے مغربی حکما (کانٹ، ہیگل، برگساں وغیرہ) سے اس نے کچھ نہ کچھ فیض حاصل کیا ضرور ہے۔ پھر بھی رومی کے مقابلے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور تو اور نٹشے کو بھی جس کے فلسفۂ حیات نے ایک حد تک اقبال پر اثر ڈالا تھا، وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کا دل تو مومن کا ہے، مگر دماغ کافر کا۔ (قلب او مومن دماغش کافر است)

اقبال نٹشے سے اتنا بیزار کیوں ہے؟ اس کے دو سبب ہیں۔ (۱) یہ کہ نٹشے میں خاص طور پر اور حکمائے مغرب میں بیشتر روحانیت کا فقدان ہے اور اقبال شدت سے روحانیت کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک روحانیت کی کمی ہی فساد کی جڑ اور ساری انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ (۲) پھر یہ کہ اقبال خود فلسفی تھا۔ نقال تو تھا نہیں کہ بے سوچے سمجھے نٹشے کے فلسفے کی نقل اڑا کے اسے اپنی شاعری کا موضوع بنا لیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا یہ صاف انکار اور بیزاری اس بنا پر ہے کہ سمندر پار کے "پنڈتوں" اور خود ہمارے یہاں کے بعض مغرب زدہ احباب نے جوشِ ہمہ دانی میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نٹشے کی نقل ہے۔ یہ سراسر زیادتی تھی، اس لئے کہ گو بظاہر اس کا فلسفہ نٹشے کے فلسفے سے مماثلت کے کچھ پہلو پیش کرتا ہے لیکن محض اس بنا پر اس کو نٹشے کی نقل نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال کے فلسفے میں چند عناصر ایسے ہیں جو اس کے اپنے اور اس کی لگاتار کوشش اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ کہیں سے کچھ قرض لینا اور پورے سود کے ساتھ اصل میں اضافہ کرنا سرقہ ہرگز نہیں! یہ تو وہی ہے جس کا حسی پیرایہ بدل کے کچھ اسی قسم کا بہتان باندھا تھا۔

غرض کہ پھر پھر یہ بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں جن سے نہ صرف میرے خیال کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں اقبال نے نٹشے سے کچھ لیا بھی ہے تو اسے کیا سے کیا کر دیا۔ "کیا اقبال نٹشے کے زیرِ اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ وہ (اقبال) ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے۔

مثال کے طور پر اسرار خودی کی حکایت "الماس و زغال" کو لیجئے جو نٹشے کی تصنیف (ارشادات زردشت) کی ایک حکایت (پتھر اور کوئلہ) سے ماخوذ ہے۔ مگر چونکہ اقبال نٹشے سے بزرگتر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا کہ الماس اس کا اپنا بن گیا۔

. . . نٹشے کی طرح اقبال بھی درست فکر و فعل رکھتا ہی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا جو حیرت انگیز اثر ہوا ہے وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ . . . ؟

تاہم یہ مثنویاں جا بجا نوِ مشق کا پتہ دیتی ہیں، خصوصاً رموزِ بے خودی جس میں سب سے زیادہ فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے اور شعریت کم۔ اپنے شاعرانہ کمال کے بہتر نمونے اقبال نے بعد میں پیش کئے جن کے آگے یہ مثنویاں پھیکی ہیں۔ البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحہ عمل ہونے کی حیثیت سے ان مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے۔

رموزِ بے خودی کی اشاعت سے ایک سال پہلے (جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا ہے) جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اس کے اثرات سب پر پڑے۔ اتحادی جو ہارے وہ تو ہارے ہی تھے جو جیتے ان کی بھی برائے نام جیت رہی۔ جو بے تعلق رہے، وہ بھی کچھ نفع میں نہ رہے۔ ورسائی میں جرمن قوم کی ابدی غلامی کا سرخط تیار ہوا۔ ترکوں کا کوئی مستقبل نہ رہا۔ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا فوجی قبضہ تھا۔ سلطان وحید الدین خاں کی نام نہاد خلافت صرف جمعہ کے خطبوں کی حد تک رہ گئی تھی۔ روس کے نظام زار کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ مشرق قریب میں شام و عرب کی خوں آشام سرزمین دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی تھی اور برطانیہ اور فرانس کے تدبر نے اپنی عیاریوں سے عربوں اور شامیوں کی کمک سے ترکوں کو ان ممالک سے بے دخل کرنے کے بعد، نوضیت اور نفسا نفسی کا راج قائم کر دیا تھا۔

غرض کہ اسلامی ممالک کا بظاہر کوئی مستقبل نہ تھا۔ مغرب کی سیاست نے مشرق کو ایسی زک دی تھی کہ صدیوں تک اس کا ابھرنا دوبھر نظر آتا تھا۔ اور پان اسلامی تحریک، اور مشرق کی بیداری کا خواب محض سراب معلوم ہونے لگا۔

اس زبردست جھٹکے نے اور اقوام عالم کو بھی ایک طرح سے پریشان کر رکھا تھا۔ تجارت کی وہ گرم بازاری نہ رہی۔ عالمی کساد بازاری، بے روزگاری، افلاس اور فاقہ مستی کے مسائل نے دنیا کے مفکرین اور معاشیات کے ماہرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کیا۔ یہی مسائل ہندوستان کے سامنے بھی تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۲۱ء میں بڑی گرماگرمی کے ساتھ ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی جس کی باگیں مسٹر گاندھی کے ہاتھوں میں آئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے اور ترک موالات اور خلافت کی تحریک ایک ساتھ چلنے لگی۔ علی برادران اور گاندھی جی کا اتحاد و تعاون اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں خوب رنگ لایا۔ لیکن اکبر جیسے اہلِ نظر پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ یہ دوستی دیر تک نبھنے والی نہیں، چنانچہ بعد میں جو واقعات درپیش ہوئے، ان سے اکبر کی دور نگاہی زبان زد خاص و عام ہو گئی۔ ہر عارف و عامی کی زبان پر یہ شعر تھا:

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں، مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اس عالم میں اقبال بیٹھے کیا کرتے تھے؟ بہتیروں کا خیال تھا کہ اقبال کی "حجازی لے" سو ہو گئی۔ لیکن اس موقع پر بھی وہ چپکے نہ تھے۔ علاوہ کب چوکنے والے تھے؟ الگ تھلگ بیٹھے ایک نہ ایک پتے کی بات کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے مسلمانانِ ہند کی جانب سے ترکوں اور خلیفۂ عثمانی کو آزاد کرنے کی اپیل کرے، تو اقبال نے اس کوشش کی بیہودگی پر زہر خند اگلا۔ چند اشعار کی ایک مختصر سی نظم تھی لیکن بڑی دور نگاہی کا پتہ دیتی تھی۔ عنوان تھا "دریوزۂ خلافت"

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے   تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟   خلافت کی کرنے لگا تو گدائی؟
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن ابھی تک کوئی طویل نظم ایسی نہیں پیش کی گئی تھی جس سے جنگِ عظیم کے ان پریشان کن مسائل پر کافی روشنی پڑتی اور یہ معلوم ہو سکتا کہ ان حالات میں اقبال کے پیشِ نظر کس قسم کے منصوبے ہیں۔ آخر کار ۱۹۲۱ء کے یا ۱۹۲۲ء کے شروع میں وہ نظم شائع ہوئی جو حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے۔ ایک خضرِ طریقت کی طرح اپنی اس نظم (خضرِ راہ) میں اقبال نے ان تمام واقعات کا جائزہ لیا ہے جو اقوامِ عالم اور خصوصاً ایشیا والوں کی پریشانی کا باعث تھے۔ نظم کی ابتدا ایک گہرے اور پرسکون منظر سے ہوتی ہے۔ رات کا سناٹا ہے اور دریا کا کنارہ۔ زندگی کی چہل پہل چپ چاپ ہے۔ دریا کی موجیں ایک ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر پانی کی گہرائیوں میں سو گئی ہیں۔ جبکہ چاروں طرف ہول سکوت چھایا ہے۔ تاروں کی چھاؤں میں خضر سے شاعر کی ملاقات ہوتی ہے۔ شاعر، خضر سے کچھ سوالات کرتا ہے۔ یہ وہی سوالات ہیں جو اوروں کی طرح اسے بھی پریشان کر رہے ہیں۔ خضر ان سب کا امید افزا جواب دیتا ہے۔ ان جوابات میں اقبال کا سارا رجائی فلسفہ جھلک رہا ہے۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر   گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر   تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب؟
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار   موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما، خضر   جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب!
کہہ رہا ہے مجھ سے "اے جویائے اسرارِ ازل!   چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب"

خضر کا اتنا اشارہ شاعر کے لئے ایک "سوال ہند" بن جاتا ہے۔ وہ خضر سے پے در پے کئی ایک سوال کرتا ہے۔ وہ سوالات کیا ہیں سنئے

چھوڑ کر آبادیاں، رہتا ہے تو صحرا نورد — زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ — اور سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک — نوجواں، اقوامِ نو دولت کے ہیں پیراہن پوش
بیچتا ہے ہاشمی، ناموسِ دینِ مصطفیٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ان پریشان مسائل کے جو جوابات خضر نے دیئے ہیں ان سے خود اقبال کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ہر عنوان کے ذیل میں کئی ایک اشعار ہیں جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہر سرخی کے معنوی پہلو کو روشن کرتے ہیں اور ہر رنگ میں اقبال کی بے نظیر رجائیت نومیدوں کو امید دلاتی ہے۔ چاروں طرف مایوسی اور پریشانی کا عالم طاری ہے، بڑے بڑے سیانے حواس باختہ ہیں۔ مگر اقبال کے ماتھے پر شکن تک نہیں۔ پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ یونانی فوجیں بری طرح قسطنطنیہ سے خارج ہوئیں۔ اب کیا تھا ایک دھوم مچ گئی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفیٰ کمال پر پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں۔ طلوعِ اسلام اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ خوشی تادیر رہنے والی نہ تھی، اس لئے کہ بعد میں کمال نے جو روش اختیار کی اس سے اقبال کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور اقبال نے پھر کبھی اس طرف کو مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ گو ترکی اور ایران نے نئے سرے سے جنم لیا۔ افغانستان نے بھی امان اللہ خاں کی قیادت میں آہستہ آہستہ رضا اور کمال کے نقشِ قدم پر چلنے کی ٹھان لی "عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا" لیکن ان ممالک کی مغرب زدہ چالیں اقبال کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہیں۔ لہٰذا یہاں سے اپنے فلسفے کے اجتماعی پہلوؤں کو چھوڑ کر انہوں نے خودی کی نوا کو تلخ تر کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ بے خودی کی تمام "خودی" کے شور و نشور میں گم ہو گئی۔ یہاں سے مسلسل کئی سال تک اقبال کی نوا عجمی (فارسی) ہی رہی اور ۱۹۳۲ء یعنی جاوید نامہ کے شائع ہونے تک اردو زبان میں اقبال نے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا؟ اردو کی جگہ فارسی نے لی۔

اقبال کی فارسی کا شباب طلوعِ اسلام کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے فلسفہ زیادہ ہے اور شعریت کم۔ پیامِ مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور نو مشقی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔

اسرار و رموز کی شراب، سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

پیامِ مشرق چار حصوں میں تقسیم ہوئی ہے۔ شروع کے ۱۶۳ صفحوں میں قطعہ نما رباعیاں ہیں جن میں لطفِ زبان کے ساتھ خودی کے وجد آفریں رموز بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان ہے "افکار" مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں کچھ عنوانات بانگِ درا کی نظموں کے عنوانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ (مثلاً افکارِ انجم، شبنم، لالہ، بوئے گل) لیکن یہاں ایک نئے انداز سے قدرت کے عناصر اور حسنِ بے پایاں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصلِ بہار، کشمیر اور ساقی نامہ میں اقبال کا رنگین تخیل انتہائی زور کے ساتھ فارسی زبان میں پھول برسا رہا ہے۔ بعض نظمیں خیال کی ندرت، زبان کی گھلاوٹ اور اسلوب کی جدت کے لحاظ سے فارسی ادب میں ایک انمول اضافہ ہیں۔ ایرانِ جدید کے بعض شعرا نے جوشیلے اور پرکیف گیت لکھے ہیں۔ اقبال کی نوائے وقت کو بھی پڑھئے جو ایرانِ جدید کے کئی ایک ترانوں پر بھاری ہے۔ پوری نظم ولولہ انگیز ہے خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ یہاں نقل کرتا۔

حافظ کے ایک مشہور مصرعے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا "بدہ ساقی مے باقی" تیسرے حصے کا عنوان ہے۔ حافظ کی مینا میں فلسفۂ خودی کی شراب عجیب بہار دکھاتی ہے۔ بعد کو یہی رنگ نکھر کر ایک نئے انداز سے زبورِ عجم میں نمودار ہوتی ہے۔

چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ہے "نقشِ فرنگ" جس میں مغرب کے بعض حکما، اور مشاہیر مثلاً نطشے، برگسان، ہیگل، ٹالسٹائی، ہائنا، بائرن وغیرہ پر مزے کے تبصرے ہیں۔ پوری کتاب گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب ہے۔

پیامِ مشرق کے غالباً دو سال بعد زبورِ عجم شائع ہوئی جس میں اقبال نے اپنا سارا فلسفۂ حیات راگ اور نغمے کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ فردوسی کو بھی دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی فارسی سے عجم کو زندہ کیا۔ مگر یہ دعویٰ قصے کہانی اور رزمیہ افسانہ نگاری کی حد تک درست تھا۔ اقبال نے حقائق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے اور صدیوں کی سوئی ہوئی قوموں کو اپنے حیات پرور نغموں سے زندگی اور بیداری کا پیغام سنایا ہے۔ یہ جانفزا ترانے غزل کے دلکش سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ راگ اور رنگ مشرق کی جان ہے۔ اقبال اس راز کو خوب جانتے ہیں اور ایک ماہرِ نفسیات کی طرح مریض کی نفسیات کو پہچان کر حافظ کی مینا میں خودی کی شراب چھلکائی ہے۔ نتیجہ اس کا خاطر خواہ ہوا۔ زبان کے چٹخاروں پر جان دینے والوں نے جس خشک فلسفہ کو اسرار و رموز میں بہ جبر پڑھا تھا، اسے زبورِ عجم کی پرکیف زبان میں انھیں مزے سے لے کر پڑھا۔

پوری کتاب چار حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ ۸۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۶۶ نغمے ہیں۔ میں ان کو نغمے ہی کہوں گا اس لئے کہ گو ان کا ظاہری روپ غزل کا ہے مگر یہ غزلیں نہیں ہیں۔ ان نغموں میں بعض کی بحریں اور ردیف و قوافی، حافظ کی غزلوں کا کیف رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں مدہوشی نہیں۔ دو ایک نغمے مخمس، مثلث اور ترکیب بند کی شکل میں بھی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ نغمے سب کے سب پڑھے جائیں۔ محض ایک اندازے کی خاطر چند اشعار یہاں پیش کروں گا۔ پہلا نغمہ ہی سنئے۔ دیکھئے کیسے غزل کی ہے،

مگر غزل یہی:

فصل بہار ایں چنیں، بانگ ہزار ایں چنیں
چہرہ گشا، غزل سرا، بادہ بیار، ایں چنیں

اشک چکیدہ ام ببیں، ہم بہ نگاہ خود نگر
ریز بہ نیستان من، برق و شرار ایں چنیں

باد بہار را بگو، پے بہ خیال من برد
وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں

زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتے
در چمن تو زیستم با گل و خار ایں چنیں

عالم آب و خاک را بر محک دلم بسائے
روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

دل بہ کسے نباختہ، با دو جہاں نساختہ
من بہ حضور می رسم، روز شمار ایں چنیں

ذرا اس دل کی بھی بہار دیکھئے، مگر یہ ہمارے ہاں کے عشاق کا دل نہیں، یہ دل ایک مرد خود آگاہ کا دل ہے:-

بندہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادۂ خویش است
بگیر ایں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است

بدہ آں دل، بدہ آں دل، کہ گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل، بگیر ایں دل کہ در بند کم و بیش است

مرا اے صید گیر از ترکش تقدیر بیروں کش
جگر دوزی چہ می آید از آں تیرے کہ در کیش است

نگردد زندگانی خستہ از کار جہاں گیری
جہانے در گرو دستم، جہان دیگرے پیش است

ایک آخری مثال۔ اشعار کیا ہیں سرود حیات۔ رمز و اشارے میں کیسے پتے کی باتیں کہہ دی ہیں:-

چند بروئے خود کشی، پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا، تمام کن، جلوۂ ناتمام را

من بہ سرود زندگی، آتش او فسردہ ام
تو نم شبنمے بدہ، لالۂ تشنہ کام را

عقل ورق ورق بگشت، عشق بہ نکتہ رسید
طائر زیرکے برد، دانۂ زیر دام را

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را

وقت برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو، کجا برم ہم نفسان خام را

دوسرا حصہ پہلے حصے سے کچھ کم جاذب توجہ نہیں۔ اس حصے کی منظوم سرخی ہی وہ معنویت رکھتی ہے کہ اس میں اقبال کا سارا فلسفہ سمٹ سمٹا کر بیت الغزل بن گیا ہے۔ شعر ہے:

شاخ نہال سدرہ، خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی، منکر خویش ہم مشو

اقبال خودی کا یہ پرچار بار بار کیوں کرتے ہیں؟ اس کا سبب کچھ انہیں کے برجستہ الفاظ میں سنئے:

چو موج مست خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشیں و پا بہ داماں کش؟

به قصد صید پلنگ، از چمن سرا برخیز! — به کوه رخت کشا، خیمه در بیابان کش
به مهر و ماه کمند گلو فشار انداز — ستاره را ز فلک گیر و در گریبان کش
گرفتم این که شراب خودی بسے تلخ است — به درد خویش نگر، زہر ما بہ درمان کش

تناسب کا احساس مجھے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ پوری زبور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس حصے کے صرف ایک نغمے کو یہاں جگہ دی گئی ہے۔ پڑھنے والے کے ذوق خودی کو بیدار کرنے اور اس کے خون میں گرمی پیدا کرنے کے لئے ایسے ۸۴ نغمے اور ہیں۔ البتہ حصہ اول و دوم کے ترجیع بند ۱۹، ۱۸، ۱۹ اور ۳۰ بڑے جوشیلے اور اثر آفریں نغمے یا ترانے ہیں۔ ان ترانوں کے ترجیعی مصرعوں کے ٹکڑے ہیں: (۱) "انقلاب اے انقلاب" اور (۲) "از خواب گراں خیز!"

تیسرے حصے کا عنوان ہے "گلشن راز جدید" جس میں نو منظوم سوالوں کے بطرز مثنوی مفصل جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ سوال اور ان کے جوابات چند فلسفیانہ موشگافیوں سے متعلق ہیں جو عام دلچسپی کا سامان نہیں رکھتے۔ چوتھے حصے کا عنوان ہے "بندگی نامہ" جس میں بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری پر اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو بعضوں کے نزدیک درست اور بہتوں کے نزدیک بحث و نزاع کا موضوع ہیں۔ لیکن ہر جگہ شاعر کی جادو بیانی پڑھنے والوں کی زبان بندی کر دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پہلے دو حصے زبور کی جان ہیں۔

زبور عجم کی اشاعت کے دو ایک سال بعد ہی اقبال نے اپنے اس لازوال تصنیف کے تانے بانے درست کرنے شروع کئے جس نے اقبال کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اس سے میری مراد ہے جاوید نامہ جو اقبال کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ اور اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ اب تک جو کچھ اقبال نے کہا اور کسی سطح سے کہا تھا، لیکن یہاں جو کچھ کہا ہے ایسے بلند مقام سے کہا ہے جہاں الہام اور شعر، عرفان اور وارداتِ عالیہ کی حدیں ملتی ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است — ایں کتاب از آسمانے دیگر است

آسکر وائیلڈ کا قول ہے کہ "فن کار کا عمل اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے"۔ جاوید نامہ اقبال کی یگانہ سرشت کا وہ بے مثل ثمر ہے جس کی مثال خود اقبال کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلسل تین سال تک اس کتاب کی تخلیق میں اقبال نے اپنی توانائی بے دریغ صرف کی، جب کہیں یہ انمول موتی عدم سے وجود میں آیا۔ ۱۹۲۹ء میں جب اقبال مدراس اور بنگلور میں اپنے خطابات سنا کر حیدر آباد آئے تھے، اس زمانے میں اس کتاب کے کچھ دھندلے نقوش ان کے ذہن میں تھے۔ اس موقع پر جب میں نے ان کو دیکھا تو ایک خاص تفکر اور پریشانی کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں تھے۔ یہ وہ آثار تھے جو کسی شاہکار کی تخلیق سے پہلے کسی فن کار کے چہرے سے "غم پنہاں" کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ فکر مند اور کھوئے ہوئے سے

معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی انتہائی سوچ میں کسی چیز کی تلاش یا دھن میں ہو ۔ ۔ ۔ بعینہٖ وہ دھن اور فکرمندی جو کسی اعلیٰ تخلیق کاری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس انوکھی فکرمندی کا نتیجہ اس وقت نکلا جب ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شائع ہوا۔

ملٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی "گمشدہ فردوس" اس کی تمام زندگی کا حاصل اور اس کے شاعرانہ کمال کا نچوڑ ہے۔ اپنی ساری توانائی اس نے اس کتاب پر صرف کر دی، جب کہیں اس لازوال کتاب کے نقوش اس کے قلم سے نغمے اور شعر کے پیکر میں ظاہر ہوئے۔ بعد کو اور بھی چیزیں اس کے قلم سے نکلیں لیکن یہ بات کسی میں نہ آئی۔ یہ مثل اقبال کے جاوید نامہ پر بھی صادق آتی ہے جس کی تیاری میں اس نے اپنا خونِ حیات پانی کی طرح بہا دیا۔ بعد کو دو مجموعے اردو کے اور ایک مجموعہ فارسی کا بھی نکلا۔ اردو کے پرستاروں کی جان میں جان آئی کہ اقبال نے پھر اردو کی طرف توجہ کی۔ لیکن میری رائے میں یہ دونوں کتابیں ایک تھکے ہوئے نقش کار کے وہ نقوش ہیں جو اس نے بائیں ہاتھ سے کھینچے ہیں۔ مانا کہ ان نقوش میں وہ کمال ہے جو بہتیرے باکمالوں کے داہنے ہاتھ کی تخلیق کاریوں میں نہیں، پھر بھی جاوید نامے کے آگے ضربِ کلیم اور بالِ جبریل گھٹیا درجے کی چیزیں ہیں۔ مولانا اسلم جیراج پوری، جاوید نامے کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ۔ لیکن اب جاوید نامے کو پانچویں کتاب سمجھنا چاہیے، جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے۔

شکر کا مقام ہے کہ یہ کتاب نصاب میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگ شوق سے اپنے طور پر اس کو پڑھیں۔ جبراً پڑھانے اور شامل نصاب کرنے میں ایک شاہکار کا حسن مارا جاتا ہے اور وہی مثل صادق آتی ہے کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد"؟

ایک بلند پایہ تصنیف کی حیثیت سے یہ کتاب یوں بھی تفصیلی تنقید سے بے نیاز ہے۔ میں خود بھی اس جوشِ تنقید اور زورِ ہمہ دانی کو برا سمجھتا ہوں جبکہ ایک برخود غلط تنقید نگار کسی اچھی کتاب کا سب رس نکالنے کی کوشش میں اسے بے رس بنا دیتا ہے۔ آرٹ وہی ہے جو تنقید و تحریف کی حدوں میں نہ آئے۔ اس لئے میں صرف ایسے امور پر اکتفا کروں گا جن سے اس کتاب کو اپنے طور پر پڑھ کر محظوظ ہونے میں آپ کو آسانی ہو۔

ساری کتاب رنگین تخیل، شاعرانہ پروازِ نظر اور فلسفیانہ بلند نگاہی کے ساتھ، ادبی اور فنکارانہ لطافتوں سے مالا مال ہے۔ زبان میں پختگی کے علاوہ بلا کی مٹھاس ہے۔ کتاب کا سارا انداز مثنوی میں ہے لیکن جا بجا پر کیف نغمے بھی غزل کے سانچے میں پیش کئے گئے ہیں جن میں بلا کا ترنم اور شعریت ہے۔ ان میں سے بعض نغمے تو وہی ہیں جو زبورِ عجم سے لے کر یہاں پر مناسب موقع پر شامل

کر دیئے گئے ہیں۔ غزلوں کا یہ حصہ اُن کو کام عجب بہار دکھاتا ہے۔

کتاب کے شروع میں شاعر کا منظوم دیباچہ ہے جس سے اس نظم جاوید کا معنوی پہلو چار مصرعوں میں آئینہ ہو جاتا ہے:

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بود است　　بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست　　کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

شکوہ اور جواب شکوہ میں بھی اقبال ہنگامۂ زمین سے دور آسمانوں کے اس پار گئے تھے۔ لیکن یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ یہ فن کارانہ بلندی انھیں نصیب نہ ہوئی تھی۔ صرف زبانی جمع خرچ تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی زمین سے بنکا رتا ہو۔ لیکن اس مرتبہ وہ پورے اہتمام اور فن کارانہ تفصیل کے ساتھ مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں اور اس طرح نوبت بہ نوبت اور منزل بہ منزل فرازِ آسمان کا رخ کرتے ہیں اور اپنے عرفانی مدارج کا ہر زینہ الفاظ کے نقوش سے اس طرح روشن کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی ساتھ ہی ساتھ اس نئی دنیا کو دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو دیباچہ کے علاوہ "مناجات" (جس سے کتاب دراصل شروع ہوتی ہے) تمہید آسمانی، تمہید زمینی کو بغور پڑھیئے جن کے ذریعے شاعر نے مختلف دلپذیر طریقوں سے واقعیت کا طلسم باندھا ہے۔ مناجات کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ اس "جہانِ ہفت رنگ" میں انسان کو سدا درد آشنا رفیق کی تلاش رہتی ہے کہ اس سے اپنے دل کا ماجرا بیان کرے۔ لیکن وہ ناکام ہی رہتا ہے اس لئے کہ ان مٹی کے پتلوں سے دل دہی کی امید رکھنا ہی عبث ہے، خصوصاً اس دور میں کہ انسان دور بیں ہے مگر بصیرت نہیں رکھتا۔

غرض کہ نہایت دل آویز طریقوں اور نازک تشبیہوں اور اشاروں سے بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا کی جاتی ہے، یہانتک کہ شاعر کے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی پذیرائی کا پڑھنے والے کو بھی یقین سا ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد تمہید آسمانی میں زمین کی بے رونقی پر آسمان کا زہر اگلنا، پھر جنابِ باری میں زمین کی درد بھری فریاد اور رحمت باری کا جوش میں آکر خاکدانِ ہستی کو شاداب اور نہال کرنے کا وعدہ اور پھر ندائے غیبی کے بعد نغمۂ ملائک کی امید افزا بشارت، یہ سب چیزیں اس کمال اور فن کارانہ اہتمام کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جبکہ اقبال کو وہ معراجِ عرفان حاصل ہو جائے جس کے وہ آرزومند ہیں۔ نغمۂ ملائک کے اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ دیکھیے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد بھی ان کی یہ بہار ہے، تو اپنی جگہ پر کیا عالم ہوگا۔ سارے اشعار ترنم اور رجائیت میں شرابور ہیں:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے　　زمیں از کوکبِ تقدیرِ اُو، گردوں شود روزے
خیالِ اُو کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد　　ز گردابِ سپہرِ نیلگوں، بیروں شود روزے

یکے در معنیٔ آدم نگر، از ما چہ می پرسی | ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے | کہ یزداں را دل از تاثیر او، پرخوں شود روزے

(تمہید آسمانی - جاوید نامہ)

نغمۂ ملائک ابھی کانوں میں گونج ہی رہا ہوتا ہے کہ شام کی شعریت سے لبریز سمانے میں شاعر، مولانا روم کی ایک مستانہ غزل دریا کے کنارے گنگناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اشعار کے الفاظ بھی بڑے برمحل اور ذو معنی ہیں۔ ان پہلودار الفاظ اور تشبیہوں کی آڑ میں ایک جگہ اقبال نے اپنے زمانے کے "دیو و دد" اور ان کی فرعونیت پر بھیرانہ لہجے میں برہمی کا اظہار کیا ہے۔ یہ چیز ضرب کلیم میں اور بھی نمایاں ہوگئی ہے، جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ چنانچہ چند اشعار تمہید زمینی کے پیش کرتا ہوں۔ ضرب کلیم کا حوالہ بطور جملہ معترضہ کے تھا۔

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزو است | بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزو است
یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار | رقص چنیں میانۂ میدانم آرزو است
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلم او | آں نور جیب موسیٰ عمرانم آرزو است
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر | کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزو است
زیں ہمرہان سست عناصر، دلم گرفت | شیر خدا و رستم دستانم آرزو است

(تمہید زمینی - جاوید نامہ)

شعر خوانی کا سلسلہ ختم ہونے پر، شعریت اور سکون سے اس لبریز ماحول میں دریا کے کنارے کچھ دور ایک پیکر نور، پوری آب و تاب کے جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ وہی خضر طریقت ہے جس کے غائبانہ فیض نے اقبال سے اسرار و رموز لکھوایا تھا۔ یہاں سے بے محابہ سوالوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے اور پیر روم اقبال کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔ پھر معراج کے اسرار سے باخبر کرتے ہیں۔ معراج کیا ہے؟ شعور کامل جس کے تین مدارج ہیں (۱) شعور ذات۔ (۲) شعور غیر۔ (۳) شعور حق تعالیٰ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

بر مقام خود رسیدن ۰ زندگی است | ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
چیست معراج ؟ آرزوئے شاہدے | امتحانے روبروئے شاہدے
پیکر فرسودہ را دیگر تراش | امتحان خویش کن موجودہ باش

تو از یں ناآسماں ترسی ؟ مترس | از فراخائے جہاں ترسی ؟ مترس
چشم بکشا . بر زمان و بر مکاں | ایں دو یک حال است از احوال جاں

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است — با مقامِ چار سو خو کردن است

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق — وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

ایں بدن با جانِ ما انبار نیست — مشت خاکے مانعِ پرواز نیست

رومی کے ان الفاظ سے شاعر اپنے میں ایک غیر معمولی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں اور رومی کی معیت میں شاعر عالمِ علوی کی سیر کرتا ہے جہاں زروان (روحِ زمان و مکان) سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رہا سہا حجاب بھی دور ہو جاتا ہے۔ زروان کی نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ شاعر خود کو عالمِ افلاک کی طرف اُڑتا ہوا پاتا ہے۔ یہ کیفیت کیسے طاری ہوئی؟ اس کا لطف کچھ شاعر ہی کی زبان سے آئے گا:

در نگاہے او نمی دانم چہ بود — از نگاہم ایں کہن عالم ربود

یا نگاہم بر دگر عالم کشود — یا دگرگوں شد ہمیں عالم کہ بود

مُردم اندر کائنات رنگ و بو — زادم اندر عالم بے ہائے و ہو

تن سبک تر گشت و جاں سیارتر — چشمِ دل بینندہ و بیدارتر

اب کیا تھا۔ پر سے اڑنے لگے۔ مختلف سیاروں کی خبر لی۔ پہلے فلکِ قمر پر پہنچے اور اس کے بعد دوسرے سیاروں کا جائزہ لیا۔ ہر جگہ اقبال کے جبریلِ امین ساتھ ہیں۔ اب یہاں سے اپنے طور پر معراجِ اقبال کا کمال دیکھیے۔ آگے کیا بیان کیجیے کہ تنقید کے پر جلتے ہیں۔ مزہ جب ہی ہے کہ نشانِ منزل تھوڑا بہت بتانے کے بعد پڑھنے والا خود پڑھے اگر سچ لطف اٹھانا چاہتا ہے۔

کتاب کے خاتمے پر بطور ضمیمہ کچھ اشعار ہیں جن میں اقبال کے فرزند جاوید سے خطاب ہے۔ اصل میں یہ خطاب ساری نئی پود سے ہے۔ نوجوانوں ہی سے اقبال کو بجا طور پر امیدیں ہیں۔ بڈھے تو بے موسم کے پھل ہیں:

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن

بر جوانان سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

(مناجات ۔ جاوید نامہ)

وہی "تنگنائے غزل" جس کے غالب کبھی شاکی تھے، اقبال نے اس میں اب "بقدرِ شوق" وسعت پیدا کر لی ہے اور اس کے اندر سارا فلسفۂ خودی اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق اقبال کے تمام تاثرات موجیں مارتے ہیں۔ گویا "سمندر ہے اک بوند پانی میں بند"۔ اس شاعرانہ اعجاز کا نمونہ وہ کتاب ہے جو جاوید نامے کی اشاعت سے تین سال بعد (۱۹۳۵ء) بالِ جبریل کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کتاب کا

نصف سے زیادہ حصہ زبور کا چربہ ہے اور وہی باتیں بالفاظ دیگر دہرائی گئی ہیں۔ خبر نہیں اقبال نے اس کا نام بال جبریل کیوں رکھا۔ زبور ہند بہتر نام ہوتا۔ ممکن ہے کہ جاوید نامہ میں سیر افلاک کرنے کے بعد بھی اس دنیا کے طلسمی مناظر دماغ میں گھوم رہے تھے جن کی بنا پر اقبال نے غالباً اس نام کو زیادہ موزوں پایا۔

جن پر فارسی کے دروازے بند ہیں، انھیں بال جبریل پر قناعت کرنی چاہیے۔ پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامے پر انتہائی زور اور شاعرانہ توانائی صرف کرنے کے بعد اقبال نے اردو کا رخ کیا۔ گو وہ تنوع جو پیام مشرق میں ہے، یا وہ تغزل اور برجستگی جو زبور میں ہے، یا وہ فن کارانہ اہتمام اور وہ بیداری تخیل جو جاوید نامے میں ہے، اس کتاب میں نہیں، تاہم ایک بیکراں دماغ کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے بے کراں چیز ہے، اور محض اردو داں حضرات کے لیے جو فارسی کے نقشہائے رنگ رنگ سے بے بہرہ ہیں، بال جبریل زبور عجم اور جاوید نامے کا بدل ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ زبور کے ابدی نغموں کی صدائے بازگشت ہے۔ جس طرح زبور میں شراب خودی حافظ کی مینا میں پیش کی گئی ہے، بال جبریل میں وہی شراب داغ اور غالب کے گنگا جمنی ساغر میں چھلکائی گئی ہے۔ بظاہر وہی کیف شیرازانِ غزل نما نظموں میں بھی دکھائی دیتا ہے، لیکن یہ کچھ اور چیز بلکہ اقبال کی اپنی چیز ہے۔ فارسی سے برسوں شغف رہنے کے باعث زبان بانگ درا سے بہتر اور منجھی ہوئی ہے۔ اسلوب میں پختگی ہے اور بندشیں چست ہیں، مگر کہیں کہیں فارسی کی نامانوس ترکیبیں بھی آ گئی ہیں۔

دوسرا حصہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارتوں اور مقامات پر ہیں جن سے ہر مسلمان کے جذبات اب تک وابستہ ہیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اقبال جب یورپ گئے تھے تو ہسپانیہ کے ان شہروں کا جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و شائستگی کا گہوارہ تھے، نجی طور پر دورہ کیا تھا۔ مسجد قرطبہ اور دوسرے عنوانوں کی نظمیں جو ہسپانیہ سے متعلق ہیں، انہی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ایک نظم جس کا عنوان ہے "ذوق و شوق" فلسطین میں لکھی گئی تھی۔ خاصی اچھی اور پرترنم نظم ہے اور ابتدا میں مناظر قدرت کی موکشی اقبال کے حسن کارانہ کمال کا پتہ دیتی ہے، جس کے بیشتر نمونے بانگ درا میں بھی جا بجا موجود ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ اور بھی چھوٹی بڑی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ لیکن ساقی نامہ بہترین نظم ہے۔ بہار کا منظر اور قدرت کے پر بہار بیل بوٹے بڑی چابک دستی سے کھینچے گئے ہیں۔ بعد کے بندوں میں حالات حاضرہ کے بعض اہم مسائل پر کوثر کی دھلی ہوئی زبان میں تبصرے ہیں۔ پوری نظم مثنوی سحرالبیان کی طرز پر اور اسی بحر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اقبال کا سحر بیان کچھ اور ہے۔ جن کی نظریں محض لطف زبان پر ہوں، انھیں اتنا دھوکا ضرور ہوگا کہ اقبال کے پیکر میں میر حسن نے جنم تو نہیں لیا؟ یہ چند اشعار دیکھیے۔ دور حاضر کے خشک اور الجھے ہوئے مسائل کو لیا ہے لیکن کتنی سلجھی ہوئی زبان اور نکھری تشبیہوں میں بیان کیا ہے۔ شروع میں رسمی طور پر ساقی سے خطاب ہے مگر یہ ساقی کوہ فاراں کا ساقی ہے :۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!
دلِ طورِ سینا و فاران دو نیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی!

شراب کہن پھر پلا ساقیا! — وہی جام گردش میں لا ساقیا!
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خودی کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں! — مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری! — امیدیں مری، جستجوئیں مری!
مرا دل مری رزمگاہِ حیات! — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

ایک سال کے اندر باہر ضربِ کلیم (سنہ۱۹۳۷ء) بھی شائع ہوئی جس میں دورِ حاضر کی فرعونیت کے خلاف کھلا "الٹی میٹم" (اعلانِ جنگ) ہے۔ کتاب کا عنوان وجہِ تسمیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں سے اقبال کی نوا میں زوال کے آثار صاف نمایاں ہیں۔ یہی حال "پس چہ باید کرد

لے اقوامِ شرق" کا بھی ہے۔ بہرکیف لے راز دولے۔ آخر کہاں تک انسانی دماغ کام کرتا؟ دانتے کے بارے میں مشہور ہے کہ آسمانی طربیہ کے لازوال نغموں کے بعد اس کی صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ یہی حال اقبال کا ہوا۔ جاوید نامے نے انھیں زندہ جاوید کیا اور مارا بھی۔ دنیا کے اور صاحب کمالوں کی طرح وہ سخت جان تھے۔ استقلال اور ہمت نے جاوید نامے کے جاں گسل بار کے باوجود، بالِ جبریل کے اوراق ان سے مرتب کرائے۔ لیکن بالِ جبریل کی اشاعت ان کے حق میں موت کا پیش خیمہ تھی۔ کوئی تین سال اور جئے۔ لیکن کس طرح کہ دمے کی تکلیف سے ان کی جان ضیق میں تھی۔ اس پر بھی دو کتابیں لکھ ہی ڈالیں۔ دونوں (ضربِ کلیم اور پس چہ باید کرد) کتابوں میں اقبال ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو گولی کھا کر بھی اپنے دشمن پر جست کرتا ہو، موجودہ دور کی ناانصافیوں کے خلاف گرج رہے ہیں۔ دونوں کتابوں کا لہجہ وہ جلالی شان رکھتا ہے جیسے بنی اسرائیل کا کوئی نبی اپنی گمراہ قوم کو راہِ راست پر لانے کے لئے کڑک رہا ہو۔

اقبال ایک بڑا شاعر تھا اور اس کا پیغام ایک عالمگیر اپیل رکھتا ہے۔ اس کا نام تاریخ کے اوراق میں سدا جگمگاتا اور سینوں اور دلوں میں جگنو کی طرح چمکتا رہے گا۔ وہ چل بسا، مگر اس کا پیام اٹل ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

پچیس سال تک بے لوث ادبی خدمت کے بعد مشہور علمی و ادبی ماہنامہ
نیرنگِ خیال
کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ اس جوبلی سالنامہ میں مشہور اہلِ قلم کے اچھوتے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ علم و ادب کا بے جواب ذخیرہ اڑھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پرچہ ہر لحاظ سے مصور ہوگا۔ قیمت خاص جوبلی سالنامہ کی اڑھائی روپے۔ سال بھر کیلئے خریدار ہو جانے والوں کو صرف ساڑھے چھ روپے میں ملے گا۔ ہر ماہ ۸۰ صفحہ کا رسالہ شائع ہوتا ہے۔ رسالہ پابندیٔ اوقات سے ہر ماہ کی ۲ تاریخ کو راولپنڈی سے پوسٹ ہو جاتا ہے۔ جوبلی سالنامہ ۱۵ اپریل ۱۹۵۰ء کو ڈاک میں ڈال دیا جائیگا۔ آپ بھی ابھی سے خریدار بن جائیے تاکہ یہ عدیم النظیر نمبر حاصل کر سکیں۔
مینیجر نیرنگِ خیال۔ راولپنڈی

یومِ اقبال منانے والوں کیلئے

۱۔ ملک کے مختلف مقامات میں ہر سال ۲۱ اپریل کو یومِ اقبال منایا جاتا ہے۔ بہتر ہو کہ ہر مقام پر ایک ہی تاریخ کو یہ تقریب منانے کی بجائے اسے ایک ہفتہ پر پھیلا دیا جائے تاکہ ایک مقام کے لوگ دوسرے مقام میں بھی شرکت کر سکیں۔

۲۔ یہ پروگرام باہمی رابطے کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا جس کے لئے ایک مرکزی ادارے کی بھی ضرورت ہے۔ لاہور میں سب سے پہلا یومِ اقبال مجلسِ مرکزیہ یومِ اقبال مسجد شاہ چراغ لاہور کے زیرِ اہتمام منایا گیا تھا۔ ان کا حق ہے کہ مرکزی حیثیت انہی کو دی جائے۔

۳۔ مختلف مقامات پر جو مقالے پڑھے جائیں انہیں بھی مرکزی ادارے کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہ ان کے انتخاب سے ہر سال ایک مجموعہ مقالات شائع کرتا رہے۔

۴۔ سال میں ایک مرتبہ یومِ اقبال منانے سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ آپ پیغامِ اقبال کی نشر و اشاعت کے فریضہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے لئے مستقل طور پر بزمِ اقبال کی طرح ڈالئے، جو مختلف عنوانات کے ماتحت سال بھر اس پیغام کو عام کرتی رہے۔

۵۔ حکومت پر مسلسل زور دیتے رہیے کہ وہ ہر سکول اور ہر کالج میں اقبال کی تصانیف کو بطور نصاب مقرر کرے اور یونیورسٹیوں میں اس کے لئے چیئرز (Chairs) نصب کرے۔

۶۔ اس تحریک کو ہر جگہ پھیلائیے کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد خالص قرآن پر رکھی جائے جس کے اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے وقت کے تقاضوں کا عملی حل باہمی مشاورت سے تجویز کریں۔

اس ضمن میں جو خدمت بھی طلوعِ اسلام کے سپرد کی جائے وہ اسے اپنے لئے فخر و سعادت سمجھے گا کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی قرآنی پیغام کی اشاعت ہے، اور یہی اقبال کی بہترین یادگار ہے۔

مدیر طلوعِ اسلام

مقامِ اقبال

(سید عبدالواحد صاحب، پاکستان فارسیٹ سروس کراچی)

فطرت نے اقبال کو یہ معجزانہ ملکہ عطا کیا کہ جس شے کو ہاتھ لگاتے تھے وہ حسین ہو جاتی تھی۔ ان کی طبیعت میں عظیم الشان تنوع تھا۔ خواندگانِ اقبال اس تنوع کی رعنائیوں میں کھو جاتے ہیں اور ان کے لئے اقبال کے فن اور فن کا احاطہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اقبال ایک اعلیٰ ادبی فن کار ہی نہیں تھے، وہ چوٹی کے سیاست دان بھی تھے، صوبائی مقننہ کے رکن، جید فقیہ، ماہر اہلِ قلم اور مشہور قانون دان۔ ہر چند ان کی سرگرمیوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نمایاں محور شاعری، فلسفہ اور سیاست تھے ان شعبوں میں اقبال کا مطالعہ کرنے والا ہر متعلم اس درخشندہ حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ ان میں قدر مشترک انسان کی عظمت میں اقبال کا گرم جوشانہ ایمان ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اقبال کے کارناموں کو ایک عالمگیریت عطا کرتی ہے اور انہی میدانوں کے دیگر شہسواروں سے ان کو برتر اور ممتاز بناتی ہے۔ اقبال عظمتِ انسان پر جس قدر زور دیتا ہے، جب تک اس کا مفہوم کما حقہٗ سمجھ نہیں لیا جاتا ان کی کارگزاری کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اقبال کا ہر متعلم اس حقیقت سے دوچار ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان اور کائنات، اور انسان اور خدا کے باہمی تعلق کے پیمانے کس قدر انوکھے اور مختلف ہیں۔ اقبال حیاتِ انسانی کو عظمتِ انسان کی اساس محکم پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی گہری انسانی ہمدردی ہے جو ان کے فن کو عالمگیریت کا حامل بناتی ہے۔ ان کا فکر اور ان کی زندگی انسانیت کیلئے وقف ہے اور یہی اساسی خیال ان کے فن کی رگِ حیات ہے۔

فنِ شاعری میں اقبال کو استادانہ مہارت حاصل تھی۔ ان کی دلفریب شاعری کی کیفیت اور سحر کاری نے دنیا بھر کے شعرائے عظام میں ان کیلئے ممتاز اور اہم مقام تراشا ہے۔ گو ان کے بعض نقاد ان کے فن کی مقصدیت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں گویا کہ یہ ان کی اہم خامی تھی، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہ گئے ہیں کہ کلامِ اقبال کی عالمگیریت کا حقیقی راز اس حقیقت میں مستور ہے کہ انھوں نے عظمتِ انسان پر اس قدر زور دیا۔

وہ انسان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

ان کے کلام کا ایک ایک مصرع عظمتِ انسان کی حقیقت کا حامل ہے۔ ایک نظم میں وہ فرماتے ہیں:

فرشتوں نے کی حق سے اقبال کی غمازی ــــ گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی ــــ رومی ہے نہ شامی، نہ کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے ــــ آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

دیکھئے، خود فرشتوں کو اس انسان سے ابھی کیا کچھ سیکھنا ہے، جو مطلوبہ عزم وعمل کی ہم آوری سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کر سکتا ہے۔ قوائے انسانی کی گہرائی کا اس سے وسیع تر تصور اور کیا ہو سکتا ہے:

آنچہ در عالم نگنجد آدم است ــــ آنچہ در آدم نگنجد عالم است
برتر از گردوں مقام آدم است ــــ اصل تہذیب احترام آدم است

عالمگیر محاربات اور متصادم تصورات زندگی کے اس نازک دور میں ہمیں اس مردِ خبیر کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے کہ جس کی نگاہ کی وسعتیں جغرافیائی اور نسلی حجابات سے گزر کر آفاق گیر ہو گئیں، اور جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکا کہ ہماری تہذیب خاندانِ انسانی کی متحدہ جدوجہد اور مشترک احساسِ ذمہ داری کی شرمندہ تخلیق ہے:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم ــــ چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است ــــ کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

مندرجہ ذیل اشعار جن سے روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے بجا طور پر انسانیت کی انجیل کہلا سکتے ہیں:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں ــــ یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں ــــ تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

شاعری کے بعد شعبۂ فکر آتا ہے جسے اقبال نے مالا مال کر دیا ہے۔ اس ضمن میں ایک مقالہ نگار نے بجا طور پر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اقبال کی ذات میں فلسفہ اور شاعری کا جو حسین امتزاج پایا جاتا ہے وہ ماضی کے کسی مفکر میں نہیں مل سکتا۔ ان کی شاعری اور ان کا فلسفہ جداگانہ عظمتوں کے حامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی شاعری کی عظمت ان کے فلسفہ میں پوشیدہ ہو اور ان کے فلسفہ کی عظمت ان کی شاعری ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کا خمیر اس ردعمل سے اٹھایا گیا جو شرمندۂ تخلیق تھا ان مکاتب فلسفہ کا جو فنائے ذات کے داعی ہیں کہ انسانی عظمت کے نہیں بلکہ انسانی ذلت کے باعث تھے۔ انسانی انا کو اولاً اپنے ماحول سے متصادم ہو کر اس پر قابو پانا ہوتا ہے، اس تسلط سے اسے آزادی حاصل ہوتی ہے اور وہ خدا سے قریب ہو جاتا ہے‘ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

جو آزاد ترین فرد ہے۔ اس کے بعد انا کو پیہم کشمکش میں رہنا پڑتا ہے تاکہ اسے بقا حاصل ہو جائے۔ آزادی اور بقا حاصل کر کے انا اقطار السموات والارض سے نکل جاتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے۔ آزادی اور بقا کے حصول کے ساتھ ساتھ انا کو تحریک انسانیت کے تسلسل میں بھی ہاتھ بٹانا ہوتا ہے تاکہ انسانِ مکمل کی تخلیق ہو سکے، جو نصب العین حیات ہے۔ اقبال کے فلسفہ انا (خودی) کا یہ ماحصل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی اساس سہ گونہ ارتقائے انسانیت کے مستحکم عقیدہ پر استوار ہے، آزادیٔ ذات، بقائے ذات، اور تخلیقِ انسانِ کامل۔ یہ سہ گونہ ارتقا کیسے ممکن ہے؟ اس کا قدم اول استحکامِ خودی سے انسانی عظمت میں اضافہ کرنا ہے۔ انسانی شخصیت کو استحکام بخشنے والے قوی عشق اور فقر ہیں۔ اقبال نے لفظِ عشق کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک عشق محبوب کو اپنے آپ میں سمو لینے اور جذب کر لینے کا نام ہے۔ اس کا نکتہ اُخریٰ اقدار و تصورات کی تخلیق اور ان کے حصول کی جد و جہد ہے۔ فقر سے اقبال کا مفہوم وہ استغنا ہے جو کسی شخص کو کسی کام کے صلہ سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جس سے انسانوں کی اکثریت بلند نہیں ہو سکی۔

مناسب عظمت حاصل کرنے کیلئے فرد کو تنہائی میں نہیں بلکہ دیگر افراد سے مل کر مصروفِ عمل ہونا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو اجتماع میں زندگی گزارنی اور کام کرنا ہوتا ہے۔ درحقیقت اجتماعی مفاد سے شخصی مساعی کی یہ مطابقت خود فرد کیلئے مفید ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان ممکناتِ زندگی کی بلندیوں پر تن تنہا فائز نہیں ہو سکتا۔ اسے اجتماعی مقصد سے وابستہ ہونا ہی پڑتا ہے۔ مثالی معاشرت کی عمارت روحانی (غیر مادی) اقدار، مثلاً توحید کی بنیاد ہی پر اٹھائی جا سکتی ہے۔ توحید عالمگیر وحدت کو مستلزم ہے اور تمام انسانوں کو ایک برادری تصور کرتی ہے۔ یہ تمام ارکان معاشرت (افراد انسانی) کے لئے وحدت فکر و عمل کی فضا پیدا کرتی ہے اور عظمتِ انسانی کو چار چاند لگاتی ہے۔

میدانِ سیاست میں بھی اقبال انسانی عظمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے نزدیک سیاسی جد و جہد کا سرچشمہ اسی انسانی عظمت سے پھوٹتا ہے۔ لہٰذا سیاسی استحصال خارج از بحث ہے۔ اقبال کے حینِ حیات میں برصغیر ہند و پاک میں تین سیاسی قوتیں مصروفِ عمل تھے، برطانوی استعمار، نوخیز ہندو وطنیت اور مسلم قومیت۔

اقبال برصغیر کو برطانیہ کی سیاسی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ ایک قوم پر دوسری قوم کے تسلط و استیلا کے روادار نہ تھے۔ اس مشکل مسئلہ کا حل انھوں نے پاکستان تجویز کیا۔ ایک گروہ انسانی پر دوسرے گروہ انسانی کا غلبہ عظمت انسان کا نقیض تھا۔ وہ اس ذلت کو کیسے گوارا کر سکتے تھے! چنانچہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو انھوں نے قائد اعظم کو جو مکتوب تحریر فرمایا اس میں ان سیاسی مسائل کے قومی حل پر زور دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

ہندوستان کو پرامن بنانے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات دلانے کی واحد صورت مسلمانوں کی ایک علیحدہ

فیڈریشن کی مذکرہ صدر خطوط پر تشکیل ہے۔ کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو بھی قوم قرار دے

لیا جائے جو حق خود اختیاری کی ویسے ہی حقدار ہوں جیسے اندرون وبیرون ہندوستان دیگر قومیں۔

ایسے زمانہ میں جبکہ کسی شخص کی سیاسی زندگی کی کامیابی کا مدار اس امر پر تھا کہ وہ شخص کے مرتبہ جیل میں جا چکا ہے، اقبال کو قدرتی طور پر جعت پسند گردانا گیا۔ کیونکہ وہ کبھی جیل خانے نہیں گئے تھے۔ اس ضمن میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں آپ نے قائد اعظم کو لکھا:

ذاتی طور پر میں ایسے معاملہ سے متعلق جیل جانے سے گریز نہیں کروں گا جس کی زد اسلام اور ہندوستان پر پڑتی ہو۔

اقبال میں نگاہ کی وسعت اور عقیدہ کی پختگی تھی۔ ان کے نزدیک برصغیر ہندو پاک کے سیاسی مصائب کا واحد حل پاکستان میں مضمر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف پاکستان کے قیام سے ہی جملہ اقوام ہند کو حقیقی آزادی میسر آسکے گی۔

سطورِ بالا سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آرٹ، فلسفہ اور سیاست کے شعبوں میں اقبال کے فکر و عمل کا سرچشمہ عظمتِ انسان کے تحفظ کی انتہائی تمنا تھی۔ انسانی عظمت پر زور دے کر اور معاشرت کی بنیادوں کو روحانی اقدار پر رکھ کر اقبال نے انسانیت کی گراں بہا خدمت سرانجام دی ہے۔ اسی سے اقبال کا آرٹ اور فکر کیا فلسفیانہ اور کیا سیاسی، عالمگیر اور زندہ جاوید بن گیا ہے۔

بعض معترضین نے ان کے اعلیٰ آرٹ کو گرانے کی کوششیں کی ہیں۔ بعض اصحابِ فکر نے ان کے فلسفہ کی اہمیت کا اس لئے استخفاف ضروری سمجھا ہے کہ انھوں نے جابجا اسلام کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کے ایک مکتوب کا مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا جو انھوں نے ایک یورپی دوست کو لکھا تھا:

میرے فارسی کلام کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میں ایک بہتر نظامِ معاشرت کی تلاش میں ہوں، اور اس تلاش میں ایک ایسے موجود نظام کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے جس کا اہم مقصد نسل قومیت اور رنگ کے امتیازات کو یکسر مٹا دینا ہے۔

اقبال اس تصور کے خلاف برسرِپیکار رہے کہ انسانی شخصیت کی حیثیت کچھ نہیں۔ اس میں ان کی عظمت تھی۔ تمام دنیا کو کہ جس کے باشندے ہنگامی مفادات میں الجھ کر باہد گر متحارب و متصادم تھے، اقبال نے یہی درس دیا کہ انسانی شخصیت باقی رہ سکتی ہے اور آزادی کی فضا میں پرورش پا کر ترقی کر سکتی ہے۔ اسی عالمگیر اخوتِ انسانی کی گرم جوشانہ تبلیغ نے اقبال کے کارناموں پر عظمتِ لازوال کی مہر ثبت کردی۔

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی ۔۔۔ تو گوئی رومی و افغانیم من

من اول آدمِ بے رنگ و بویم ۔۔۔ ازاں پس ہندی و تورانیم من

کشمیر ——— اقبال کی نظر میں

اقبال کو کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ کشمیری الاصل تھے۔ حسنِ فطرت کی فراوانی اور "تیز بین و پختہ کار و سخت کوش" اہالیانِ کشمیر کی مظلومیت نے اقبال کے قلبِ حساس سے کشمیر کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دی۔ اقبال نے جا بجا کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کا جائزہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے جو آج کی قلیل مہلت میں ممکن نہیں۔ اسے آئندہ فرصت پر اٹھا رکھتے ہوئے کشمیر سے متعلق کلامِ اقبال کے کچھ ٹکڑے بلا تبصرہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(طلوع اسلام)

میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔

(ایک مکتوب)

کشمیر کے سلسلہ میں اس کی ضرورت نہیں کہ میں واقعات کے اس پس منظر کو بھی بیان کروں جو اس ملک میں حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا بظاہر اچانک قیام جس کا شعارِ خودی قریباً مردہ ہو چکا تھا، باوجود ان مصائب کے جو اس قیام کا لازمی نتیجہ ہیں، ہر اس شخص کیلئے مسرت کا باعث ہے جس کی نگاہ عصرِ حاضر کی ایشیائی تحریکاتِ آزادی کے محرکات پر ہے۔ اہالیانِ کشمیر کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ہونہار اور ہنرمند قوم کا اپنے تشخص میں اعتماد کا از سرِ نو احیا آخرکار نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ہندوستان بھر کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ سب سے زیادہ قابلِ مذمت فرقہ وارانہ منافرت ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اہلِ کشمیر سے قدرتی دلچسپی سے ہندوؤں نے جوابی تحریک شروع کر دی ہے جس کا مقصد از رہِ یاس یہ ہے کہ پان اسلامزم اور برطانوی تسلط کے ہوّے کھڑے کر کے کشمیر کی بربری حکومت کو بچایا جائے۔

(خطبہ مسلم کانفرنس سنہ ۱۹۳۲ء)

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے — نجوم پرن رست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بالِ تذروے — ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل — نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لبِ جو خود آرائیِ غنچہ دیدی — چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے — کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد — ز آوائے سارے، ز بانگِ ہزارے
نوا ہائے مرغِ بلند آشیانے — در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را — نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را — رہا سازد از محنتِ انتظارے
چہ خواہم دریں گلستاں گر نہ خواہم — شرابے، کتابے، ربابے، نگارے
سرت گردم اے ساقیِ ماہ سیما — بیار از نیاکانِ ما یادگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را — فروزد چو نورے، بسوزد چو نارے
شقائق برویاں ز خاکِ نژندم — بہشتے فروچیں بدشتِ غبارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں — ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشمِ امم ریخت آں اشکِ نابے — کہ تاثیرِ او گل دماند ز خارے
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب — مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چربدست و تردماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رو

دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویم فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک — خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی — تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا — دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا — دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالا
امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی — رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد — ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں ز اہلِ خطہ سوزد چوں سپند — خیزد از دل نالہ ہائے دردمند
زیرک و دراک و خوش گل ملتے است — در جہاں تردستی او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست — در نے من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است — در دیارِ خود غریب افتادہ است
دستِ مزدِ او بدستِ دیگراں — ماہیٔ رودش بہ شستِ دیگراں
کارواں ہا سوئے منزل گام گام — کارِ او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد — آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنیں — جبہ را ہموارہ سود است ایں چنیں

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است

کوہ ہائے خنگ سار او نگر — آتشیں دستِ چنارے او نگر
در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ — خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن — پنبہ پراں از کمانِ پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب — من خدا را دیدم آنجا بے حجاب
مرغکے می گفت اندر شاخسار — با پشیزے می نیرزد ایں بہار

لالہ رست و نرگسِ شہلا دمید   باد نوروزی گریبانش درید
عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر   نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بربست و کشاد   خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد
بادِ صبا اگر بہ جینوا گذر کنی   حرفے زما بمجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت وجوے و خیاباں فروختند   قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد   صیدرا سودائے صیادی چہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل   لالۂ احمر ز روئے شان خجل
تیزبین و پختہ کار و سخت کوش   از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامن گیر ماست   مطلعِ ایں اختراں کشمیر ماست
خاک مارا بے شرر دانی اگر   بردرونِ خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست   ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست

ایں ہمہ باد است کز تاثیر او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو

تو ز اہلِ خطہ نومیدی چرا؟

دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست   اخگرِ شاں زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تا بینی کہ بے آوازِ صور   ملتے برخیزد از خاکِ قبور
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر   برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم   از نوا تخریب و تعمیرِ امم

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

درِ منثور

ان موتیوں میں سے چند موتی جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر

میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں :

اسلام تقدیر کا محتاج نہیں، وہ بجائے خود تقدیر ہے۔ (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جبکہ توحید انسانیت کے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک توحید انسانیت کا اصول گوشت و پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قلبِ انسانی میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہوگا کہ اسلام قدرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو قدرت کے نسل ساز قوی کو بے کار کر دے۔ انسانوں کے سدھانے کیلئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔ (احمدیت سے متعلق - نہرو کے جواب میں)

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جو اس نے تشکیل دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئت اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے،

نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقاء کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ، پیشوا، سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و زمائم کے گیت گاتے ہیں اور انھیں خوش آئند و درخشاں بتاتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو مشلول کر دیتے ہیں اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں اس کے تصورات اور اس کے وارداتِ روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخِ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بین ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ وارداتِ و کیفیاتِ روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق۔ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط ۱۹۲۵ء)

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سعادتِ انسانی کیلئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۹ء)

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سر راج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علما میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۲۷ء)

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

(خطبہ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

ٹیپو ہندوستان کا **آخری مسلمان سپاہی** تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں، جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے، اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔

(میجر سید محمد خاں کے نام خط۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں)

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان **قائدین کا فقدان** ہے جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں، لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض **احساسِ اجتماعیت کا فقدان** ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تراش رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آتے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی، کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن **سیاسی انتشار**، بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

(خطبہ صدارت۔ ۱۹۳۰ء)

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر۔ ۱۹۳۸ء)

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ **بنی نوعِ انسان کی وحدت** ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

(خطبہ صدارت۔ ۱۹۳۰ء)

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

جو قوم دوسری اقوام سے متعلق **جذباتِ نفرت** رکھتی ہے ذلیل اور رذیل ہے۔ (خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء)

میں یورپی تصورِ وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کتنا مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔
(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کو آخرکار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک ہی محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔
(قائداعظم کے نام خط ۱۹۳۷ء)

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امرا کی اولاد کے لئے وقف ہیں، اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ . . . . سوال یہ ہے کہ مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے، لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرزِ آئین کو کما حقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حقِ معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔
(قائداعظم کے نام خط ۱۹۳۷ء)

وہ جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی وہ خود ریزی، سفاکی اور زبردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کروا ڈالا، صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی

تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۷ء)

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں، ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی۔ (منشی سراجدین کے نام خط ۱۹۱۵ء)

ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ شعرائے عجم نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ (سراجدین پال کے نام خط ۱۹۱۷ء)

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ (علامہ سلیم جیراجپوری کے نام خط ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۷ء)

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد

قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۲ء)

میرے زیرِ نظر حقائق، اخلاقی وملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔

(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

شاہیں کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (۱) خوددار اور غیرتمند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے۔ (۵) تیز نگاہ ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

شاعری میں لٹریچر بہ حیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۱ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کیلئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست (سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۵ء)

اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا منتہا قرار دیا جائے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

علامہ اقبالؒ کا ایک مکتوب

علامہ اسلم جیراجپوری کے نام

مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت پر مخالفینِ اقبال نے اچھا خاصا ہنگامہ بدیں وجہ پیدا کر دیا تھا کہ مثنوی میں انھوں نے تصوف پر شدید اعتراضات کئے تھے اور اس ضمن میں افلاطون و حافظ کو "بزرگو سفند" کہہ دیا تھا۔ حافظ جیسے "صوفی" شاعر پر اعتراضات جو بقول اقبال "ایک لٹریری اصول کی تشریح" کے طور پر تھے، نہ کہ خواجہ حافظ کی پرائیویٹ شخصیت پر تنقید کی غرض سے بھلا کیسے گوارا ہو سکتے تھے۔ اس عالم میں علامہ اسلم جیراجپوری نے سنہ ۱۹۱۹ء میں مثنوی اسرارِ خودی پر تبصرہ تحریر فرمایا* اور ذاتیات سے بالاتر رہ کر بحث کو اصل مرکز کی طرف لانے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال نے اس تنقید کو خصوصیت سے پسند فرمایا اور مندرجہ ذیل مکتوب علامہ اسلم کی طرف روانہ کیا:

لاہور ۱۷ ستمبر ۱۹ء

مخدومی اسلم تسلیم

آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر بیساختہ داد طلب ہے جس کے لئے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں

" دیر ہست مرد را دیرینہ اعتبار "

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح و توضیح تھا خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز

---

* یہ تبصرہ ہم انشاء اللہ فرصت میں شائع کریں گے۔

معلوم نہیں ساخرین اس کے اشعار دلدادہ کیوں ہو گئے۔ [illegible] آپ [illegible] بہرحال [illegible] ہو رہی ہے [illegible]
ہے مجھی تصوف [illegible] کہ اصلیت تب عام دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔

مجھے امید ہے کہ اس طرز فیصلہ دلی آپ مجھی معاف فرمائینگے آپ [illegible] مجھ پر [illegible] منون ہوں [illegible]
یہ [illegible] سلسلہ [illegible] ہوتا۔ امید ہے [illegible] بخیر ہونگے سلام

آپ کا مخلص محمد اقبال [illegible] ۱۹۱۶ء

لاہور
۱۷ مارچ ۱۹۱۶ء

مخدومی، السلام علیکم

آپ کا تبصرہ اسرارِ خودی پر "ناظر" میں دیکھا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔

"دیدمت مردے دریں قحط الرجال"

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا خواجہ کی پرائیوٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حُسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں یا مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیئے ہیں اور ان کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔ عرفی کے اشارے سے محض اس کے بعض اشعار کی طرف تلمیح مقصود تھی۔ مثلاً

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرط انصاف است

لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک مزید وجہ ان اشعار کو حذف کر دینے کی تھی۔ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا۔ جیسا کہ مجھے بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ کیمبرج کے پروفیسر نکلسن بھی اس خیال میں آپ کے ہمنوا ہیں کہ دیباچہ دوسرے ایڈیشن سے حذف نہ کرنا چاہئے تھا۔ انھوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرایا ہے شاید انگریزی ایڈیشن کے ساتھ شائع کریں۔

پیرزادہ مظفر الدین صاحب نے میرا مقصد مطلق نہیں سمجھا۔ تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی

مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا، ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ میں نے ایک تاریخ تصوف کی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔ پروفیسر نکلسن "اسلامی شاعری اور تصوف" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کر دے جو میں کرنا چاہتا تھا۔ منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جس کا ذکر ابن حزم کی "فہرست" میں ہے فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔ مؤلف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں۔ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابنِ حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ـــــ غیر صوفیا قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے۔ مذہب آفتاب پرستی کے متعلق جو تحقیقات حال میں ہو رہی ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ عجمی تصوف کے پوشیدہ مراسم کی اصلیت بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔

مجھے امید ہے کہ اس طویل خط کے لئے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ آپ کے تبصرہ سے مجھے بڑی تسکین قلب ہوئی، امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا مخلص
محمد اقبال

سید حمزہ شاہ

عربی النسل ہوپہ، رگوں میں خالص ساداتی خون، صحت اور شرافت کا فولادی مجسمہ، چین، جاپان، جاوا، سماٹرا، لنکا، افریقہ میں جا کر سائنٹفک طریقہ پر تعلیم حاصل کیا ہوا، مالش Massage کے ذریعہ نازک اور مزمن امراض کا نہایت کامیاب علاج کرنے والا، ٹوٹی ہڈیوں کے جوڑنے میں کامل مہارت رکھنے والا، اس کے علاوہ رائفل، تلوار، گتکا، u s Ja t s u کے فنونِ سپہ گری کا ماہر، عام ورزش میں اعلیٰ درجہ کا اتالیق۔

تھکے ہوئے اعصاب، گری ہوئی صحت یا فنونِ سپہ گری کی تعلیم کے لئے ان کی طرف رجوع کیجئے۔

پتہ یہ ہے: ڈاکٹر سید حمزہ شاہ ۴۴۹ پیر الٰہی بخش کالونی جیل روڈ کراچی

عمرت دراز باد فراموش گارِ من!

پاکستان کے پہلے بجٹ میں مسٹر غلام محمد وزیر خزانہ نے اعلان فرمایا تھا:

> اس شخص کی یاد میں جس نے عہدِ حاضر میں، فکرِ اسلامی میں انقلاب بپا کر دیا، جس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم پھر سے ماضی پر فخر کر سکیں اور مستقبل سے پر امید ہو سکیں جس نے ہمیں قومی وراثت اور ثقافت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، وہ پہلی شخصیت جس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا، میری مراد علامہ اقبال سے ہے، ان کی یاد میں میں نے آئندہ سال (یعنی ۴۹-۱۹۴۸) کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کا پہلا عطیہ شامل کیا ہے تاکہ ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو ان کے نام سے منسوب ہو۔ تفصیلات کہ یہ رقم عملاً کیسے خرچ کی جائے، ایوان کے مشوروں سے طے پائیں گی۔

یہ اعلان ۲۸ فروری ۱۹۴۸ء کو کیا گیا تھا۔ دو سال سے اوپر عرصے میں تین اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے علامہ اقبال کے متعلق انعامی مضامین کا اعلان بھی کر دیا اور ایک تاریخ بھی مقرر کر دی جس تک مضامین ان کے پاس پہنچ جانے چاہئیں تھے۔ حال ہی میں اس کمیٹی نے مقررہ تاریخ میں توسیع کا اعلان کیا ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انہیں کوئی مضمون موصول نہیں ہوا۔

یہ ہے اس پہلی شخصیت کی یاد منانے کا طریقہ جس نے پاکستان کا تصور دیا۔ حکومت ایک مرتبہ ایک لاکھ روپے کا عطیہ دے کر مطمئن ہے کہ اس نے اقبال کے "بے مثال عطایا" کا صلہ ادا کر دیا۔ اور ملت مطمئن ہے کہ اس نے ایک کمیٹی بنا کر اور انعامی مضامین کا اعلان کر کے سبکدوشی حاصل کر لی۔

انمول
پاکستانی طبیب کی سائنٹفک ایجاد

پائیوریا کی بُو، منہ کا ذائقہ، مسوڑھوں کا پلپلا اور ڈھیلا ہو جانا، خون بہنا اور ہر قسم کی معدہ اور منہ کے امراض کی جڑ کاٹنے کے لئے آپ اس دوا کا استعمال کیجئے جو مسوڑوں کو پیپ اور خون سے پاک کرتی ہے اور مضبوط اور خوش رنگ بناتی ہے۔ منہ کی بدبو دور کرتی اور دانتوں کی عمر بھر حفاظت کرتی ہے۔ پاکستان و ہندوستان تو کیا یورپ میں بھی کوئی دوا اتنی سریع الاثر ایجاد نہیں ہوئی۔ دانت نکلوانے سے پہلے ایکبار ضرور آزمائیں۔ لاجواب دوا ہے۔ جو

حکیم یوسف حسن صاحب کی ایجاد ہے

ملنے کا پتہ: مرکزی یونانی دواخانہ۔ ڈی اے۔ وی کالج روڈ۔ راولپنڈی

لیجئے! بتوفیقِ ایزدی

معراجِ انسانیت

نہایت آب وتاب سے شائع ہوگئی۔ ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن، علیہ التحیہ والسلام، خودِ قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ... وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت: بیس روپے۔ محصول ڈاک اور پیکنگ اڑھائی روپیہ

یہ کتاب سلسلہ معارف القرآن کی چوتھی جلد ہے۔ پہلی تین جلدیں تھوڑی سی تعداد میں باقی ہیں۔ تینوں جلدوں کی قیمت -/35 روپے۔ پورا سیٹ بذریعہ ریل منگانے سے فائدہ رہے گا۔

ادارہِ طلوع اسلام

رابسن روڈ۔ کراچی